لذتِ مطالعہ

مبصر: ڈاکٹر انوار احمد

ن۔م راشد، سیاست اور شاعری (پروفیسر فتح محمد ملک)

دوست پبلی کیشنز، اسلام آباد: ۲۰۱۰ء

فتح محمد ملک، اسلامک انٹرنیشنل یونیورسٹی اسلام آباد کے ریکٹر ہیں، ان کا شمار قومی سطح کے ان دانشوروں میں ہوتا ہے، جو تمام مشکلات کے باوجود فکرِ اقبال کی روشنی میں پاکستان کے اجتماعی وجود کو فعال دیکھنا چاہتے ہیں، تاکہ وہ عالمِ اسلام میں ایک روشن مثال بن سکے، انہیں یہ احساس ہے کہ یہ منزل آسان نہیں، اس کے لئے استعماری حیلہ گری کو سمجھنا اور اپنی خودداری اور خود آگہی (خودی) سے باوقار اور نتیجہ خیز مزاحمت سے یہ مقصد حاصل ہوسکتا ہے، اسی طرح ان کا سوچا سمجھا موقف یہ بھی ہے کہ اُردو پنجاب میں ہی پیدا ہوئی اور اس کا ابتدائی قالب پنجاب کے صوفیا نے تشکیل دیا اور اب اس زبان کے تمام تر تخلیقی اور ثقافتی امکانات پاکستان سے وابستہ ہیں۔ اپنی منصبی اور سماجی مصروفیات کو انہوں نے اپنی تصنیفی سرگرمی کے ساتھ اس طرح جوڑ دیا ہے کہ بھارت اور پاکستان سے ان تک پہنچنے والے ایم فل اور پی ایچ ڈی کے مقالات وہ پڑھتے ہیں اور ان سے نوٹس بھی لیتے ہیں، انگریزی اور اُردو میں پاکستان اور عالمِ اسلام کے بارے میں جو کتابیں لکھی جارہی ہیں، ان کا مطالعہ کرکے بھی ایک محنتی طالب علم کی طرح نوٹس لیتے ہیں۔ اور شاید وہ پاکستان کے آخری روشن خیال ہیں، جو 'نوائے وقت' کے لئے لکھتے رہتے ہیں۔ ان میں اپنے نقطۂ نظر پر قائم رہتے ہوئے ہر مکتبِ خیال سے مکالمت کرنے اور تعلقات بنانے کی بے پناہ صلاحیت ہے، وہ بیک وقت احمد ندیم قاسمی، فیض احمد فیض، ن۔م راشد، منٹو اور فراز کی شخصیات کا تخلیقی مطالعہ محبت سے کرتے رہے ہیں اور کسی ایک کو خوش کرنے کے لئے دوسرے پر حرف گیری سے گریز کرتے رہے ہیں۔ تنقیدی مضامین کے اپنے مجموعے 'تعصّبات' سے جو ادبی سفر انہوں نے شروع کیا تھا، اس میں انہوں نے قابلِ قدر اضافہ کیا ہے، ان کی دیگر کتب میں 'اندازِ نظر'، 'تحسین و تردید'، 'اقبال فکر و عمل'، 'فیض، شاعری اور سیاست'، 'احمد ندیم قاسمی شاعر اور افسانہ نگار'، 'سعادت حسن منٹو'، 'فکری تنگ دستی اور نظریاتی بیگانگی کا موسم'، 'غلاموں کی غلامی'، 'خطۂ پاک یا ارضِ پاک'، 'فتنۂ انکارِ پاکستان' "Punjabi Identity" 'کشمیر کہانی'، 'فلسطین اُردو ادب میں' اور 'تحریکِ آزادیٔ کشمیر، اُردو ادب کے آئینے میں' شامل ہیں۔ زیرِ نظر کتاب 'ن۔م راشد، سیاست اور شاعری' ان کی وہ کتاب ہے جو بلاشبہ راشد کی تفہیم کے لئے ایک نیا تناظر قائم کرتی ہے۔ عام طور پر راشد کے بارے میں چار باتیں مشہور ہیں، وہ فکرِ اقبال کے مخالف ہیں، خصوصاً عالمِ اسلام کے روشن ماضی کے کسی حصے کی بازآفرینی یا احیائے مشرق کی توقع نہیں رکھتے، بلکہ اسے 'سباویراں'

اور 'ریگِ دیروز' کی تمثیلوں سے ظاہر کرتے ہیں، وہ ترقی پسند تحریک کے مخالف تھے، وہ فکر و خیال پر اظہار کے جمالیاتی تقاضوں اور ابہام کی تکنیک کو ترجیح دیتے تھے اور 'انتقام' کے خالق نے خود سپردگی کے عالم میں مغربی معاشرت کو موقعہ دیا کہ وہ جوابی انتقام لے سکے۔ فتح ملک حیرت انگیز سہولت کے ساتھ ثابت کرتے ہیں کہ یہ سب مغالطے ہی ہیں، وہ اس کتاب کے پیش لفظ میں ہی لکھتے ہیں:

''ہماری ادبی تنقید نے جدید اُردو شاعری کے تناظر میں ن۔م راشد کے ہاں ہیئت، تکنیک اور آہنگ کے اجتہادی کارناموں کی تحسین کا حق خوب ادا کیا ہے، مگر راشد کے فنی کمالات کی یہ برحق تحسین ان کی شاعری کے فکری اور نظریاتی محاسن کا پردہ ہو کر رہ گئی ہے، اس کتاب میں اس حجاب کو اُٹھا کر راشد کی شاعری میں سیاسی شعور اور نظریاتی صلابت کی کارفرمائی سے پیدا ہونے والے محاسن کو اجاگر کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔'' (پہلی بات، ص:۹)

۱۴۴ صفحات کی اس کتاب کے ابواب ہیں، خوابِ سحر گہی، استعمار شناسی، خواب نامہ، کتابِ عشق، تصورِ انساں، سماوی سفر کا آغاز، پہلے مضمون میں راشد کی نظم 'پریڈ' کو کلیدی حوالہ بنایا گیا ہے، جو 'نیا دور' کے شمارہ ۶۱۔۶۲ میں شائع ہوئی، مگر ایک طبقہ خیال کے ردِعمل کے پیشِ نظر کسی مجموعے میں شامل نہیں:

کرسمس کے دن
اقبال
اپنے گھر کے باہر چبوترے پر کھڑا،
روحوں کی پریڈ سے،
سلامی لے رہا تھا۔
سب کے پاؤں اکھڑے ہوئے تھے،
سوائے رومی کے
سوائے نیٹشے اور برگساں کے
سوائے چند نیک دل بادشاہوں کے
اقبال، غصے میں بھرا ہوا
گھر کے اندر چلا گیا
اور دوبارہ
اپنی مومن بتیاں بنانے لگا۔۔
میری مومن بتی کیوں بجھ گئی؟

اسے پھر سے کیسے روشن کروں؟

ملک صاحب خاکسار تحریک سے راشد کی وابستگی کے سبب لکھتے ہیں:

''مجھے اس نظم میں سلامی کے چبوترے پر اقبال اور علامہ مشرقی پا بہ پا نظر آتے ہیں۔۔۔ ان کے تخلیقی لاشعور میں علامہ مشرقی بھی علامہ اقبال کی اسلامی انقلابی شاعری کے طلاطم خیز دریا ہی کی ایک سرکش لہر ہیں۔'' (ص ۱۷، ۱۸)

یہی نہیں وہ 'ریگِ دیروز' اور 'سباویراں' کے حوالے سے بنیادی ماخذ یعنی راشد ایسے باشعور شاعر کی شہادت کو بنیاد بنا کر یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں:

''اس احساس نے راشد کو شدید اذیت میں مبتلا کر رکھا تھا کہ مشرق عملاً خدا کو فراموش کر بیٹھا ہے اور ملائے حزیں بھی منجملہ اسبابِ زوالِ امت ہے، یہ طرزِ عمل اسلام سے برگشتگی کا نہیں وابستگی کا ثبوت ہے۔'' (ص:۲۵)

وہ 'سباویراں' کے حوالے سے ایم آر حبیب کا حوالہ دے کر راشد کا اپنی اس نظم پر معنی خیز تبصرہ نقل کرتے ہیں کہ:

"The poem has allegorical reference to the politicians or dictators of to day,who in their keeness to set things in order,often end up with doing exactly the opposite."

یہی نہیں وہ راشد کے تخلیقی سفر کا بغور جائزہ لیتے ہوئے اور ڈاکٹر آفتاب احمد کے ساتھ ان کی مراسلت اور دیگر دستاویزات کو شہادت بناتے ہوئے یہ وضاحت بھی کرتے ہیں کہ وہ پاکستان اور عالم اسلام کے بارے میں استعمار کی حیلہ گری سے بخوبی آگاہ تھے، تاہم منصب کی نزاکتوں کے سبب وہ اتنا برملا اظہار نہ کر سکے جوان کے بڑے ترقی پسند معاصر کر رہے تھے تاہم 'ریٹائرمنٹ کے بعد ان کی یہ تمنا' اے مرے وجود کے شہر! مجھ کو جگا بھی دو' یوں پوری ہوئی کہ وہ خواب ساز کہ جسے انہوں نے وقتی مصلحت کے تحت سُلا دیا تھا، ان کی ذات میں پھر سے جاگ اٹھا، چنانچہ وہ اپنے بیٹے سے کہتے ہیں:

ہر ایک سے یہ خواب کہو
اس سے جاگ اٹھا ہے
سویا ہوا مجذوب،
مری آگ کے پاس
ایسے مجذوب کو اک خواب بہت

خواب بہت۔۔خواب بہت۔۔
ایسے ہر مست کو
اک خواب بہت! (آگ کے پاس)

مگر المیہ یہ ہے کہ راشد کی ذات میں سویا ہوا مجذوب اس وقت بیدار ہوا، جب۔۔۔۔زوالِ جاں کی کہانی شروع ہو چکی تھی (ص؛۱۲) فتح محمد ملک نے ان کے ایک اہم مکتوب کا حوالہ دیا ہے (مشمولہ راشد ایک مطالعہ) جو پاکستانی ثقافت کے حوالے سے راشد کے نقطۂ نظر کو واضح کرتا ہے، 'ہماری سرنوشت کا تعلق مشرقِ وسطیٰ کے ساتھ زیادہ ہے اور ہندوستاں کے برِصغیر کے ساتھ کم،۔۔۔ہندوستان کے ساتھ بندھ جانا ہمارے لئے ایسا ہی ہوگا جیسے بندر اپنے قلندر کے ساتھ بندھا ہوتا ہے، اس طرح ہماری تہذیب متواتر پسپائی اختیار کرتی چلی جائے گی۔۔۔کیونکہ ہندوستان میں ایسے عناصر ہمیشہ موجود رہیں گے جو اپنی بڑھتی ہوئی آبادی کے لئے Labens Raaums (رہنے کے لئے مکاں کہ یہ جواز ہٹلر نے پولینڈ پر قبضے کے لئے پیش کیا تھا) کی تلاش میں ہوں اور پھر ہر موقع سے فائدہ اٹھا کر ہر اس شخص کا قلع قمع کرتے چلے جائیں، جن کے نام میں فارسی اور عربی شامل ہو' (ص:۵۰،۵۱)

اس کتاب میں ایک بڑی خوبی راشد کی نمایندہ تخلیقات کی دلچسپ بازخوانی ہے، ملک صاحب والہانہ انداز میں ان کی بعض نظمیں پڑھتے جاتے ہیں اور ان کا فکری تجزیہ بھی کرتے ہیں، ان میں 'حسن کوزہ گر'، 'مرگِ اسرافیل'، 'آنکھیں کالے غم کی' اور 'سومنات' شامل ہیں۔ کتاب کے ٹائٹل پر راشد کا وہ خط ہے، جو ۵/جنوری ۱۹۴۸ء کو انہوں نے اپنی بیوی کو ملتان سے لکھا تھا، جس کا اسلوب ایسا عاشقانہ ہے کہ ہم ایسے کم نصیبوں کو راشد کی حسرت کا کرشمہ دکھائی دیتا ہے کہ کاش وہ بھی سجاد ظہیر کی طرح رضیہ یا فیض کی طرح ایلس کو لکھ سکتے یا ان کی بیگم کی ہمنام صفیہ کے اس افسانوی قالب کے برابر آ سکے، جب وہ اپنے نام سے جاں نثار اختر کو خط لکھتی تھی۔ راشد کے والد ملتان میں انسپکٹر آف سکولز تھے، اور اسی انسپکٹریٹ کے لئے انہوں نے ایک رسالہ 'نخلستان' بھی مرتب کیا تھا، ملتان میں وہ نواں شہر کے محلّہ باغبان میں شیخ عبدالرحمٰن کے کرایہ دار کے طور پر رہے، جو خاکسار تحریک سے وابستہ تھے اور کمشنر آفس میں ایک سینئر انتظامی منصب پر تھے، یہیں راشد کے والد نے ان کے زائد العمر ہو جانے کے خوف سے ان کی تاریخِ پیدائش میں تبدیلی کرائی تھی، تاہم میرے علم میں نہیں کہ لاہور کی دو دانش گاہوں نے ان کی کس تاریخِ پیدائش کو تسلیم کر کے ان کے لئے یادگاری سیمینار منعقد کرائے۔

❁❁❁

عبادت برق کی (ڈاکٹر رشید امجد)

پورب اکادمی، اسلام آباد: جون ۲۰۱۰ء

رشید امجد ان لکھنے والوں میں سے ہے، جو بہت کچھ شعوری طور پر کرتے ہیں، اس لئے جب وہ اپنی ان ۶ تحریروں کو رپورتاژ کہتا ہے، جن میں سے پانچ کو سفرنامے بھی کہا جا سکتا تھا، تو شاید وہ خود بھی دُبدھا میں دکھائی دیتا ہے اگر یہ کام اُس کے پبلشر کا نہیں کہ کتاب کی پرنٹ لائن میں اسے باریک فونٹ میں سفرنامہ (سفرنامے) لکھا گیا ہے۔ ماجرا یہ ہے کہ صحافت کا ماخذ بننے والی واقعہ نویسی ہی رپورتاژ اور سفرنامہ کی بنیاد ہے اور یہ دونوں اگر صحافت سے اپنا امتیاز قائم رکھتے ہیں تو اس تخلیقی احساس اور جمالیاتی ذوق کے سبب جو ادب کے بنیادی اجزا میں سے ہے، تاہم انہیں غیر افسانوی نثر میں شمار کیا جاتا ہے، یہ اور بات کہ ہمارے بعض سفرنامہ نگاروں، خصوصاً مستنصر حسین تارڑ نے سفرنامے کو بھی فسانہ بنا دیا، دوسرے شعری مجموعوں کی طرح اردو میں بھی سفرنامے بھی کچھ ایسے ارزاں ہوئے کہ رشید امجد جیسے باشعور نے خیال کیا کہ اپنے پانچ مختصر سفرنامے اور ایک ناسٹلجائی نظر اپنے پنڈی شہر پر کیوں نہ رپورتاژ کے نام سے پیش کئے جائیں؟ دوسرے رشید امجد اردو ادبیات کے ایک سینئر استاد اور نقاد کے طور پر جانتا ہے کہ ہم اُردو میں صرف پانچ رپورتاژوں کا ذکر اس طرح کرتے ہیں کہ گویا اشرافیہ کا مقدر تھا کہ وہ اسے لکھتے اور ممتاز شیریں کی ان پر نظر پڑتی اور وہ اپنی کتاب میں ان کا ذکر کر دیتی (محمود ہاشمی کا 'کشمیر اداس ہے'، فکر تونسوی کا 'چھٹا دریا'، شاہد احمد دہلوی کا 'دلی کی بپتا'، کرشن چندر کا 'پودے'، قرۃ العین حیدر کا 'ستمبر کا چاند') یا پھر امتیاز بلوچ نے ابراہیم جلیس پر ڈاکٹریٹ کا مقالہ لکھتے ہوئے ایک اور رپورتاژ 'شہر' کا ذکر کیا اور اسے ایڈٹ کر کے چھاپ بھی دیا۔

رشید امجد، اُردو کے افسانہ نگاروں کی پہلی صف میں شامل ہے، وہ انٹرنیشنل اسلامک یونیورسٹی اسلام آباد میں صدرِ شعبہ اُردو ہے، اس کی دلچسپ آپ بیتی بھی شائع ہو چکی ہے، میرؔ اجی پر اس کا تحقیقی مقالہ بھی شائع ہوا مگر وہ جس طرح خود منتخبِ روزگار ہے، اسے ادبیات کے انتخاب شائع کرنے میں بھی مہارت ہے، حالانکہ وہ 'شرموں والا' آدمی ہے، کسی کو انکار بھی نہیں کر سکتا۔ اس نے اس کتاب کا نام غالبؔ کے اس بے مثال شعر سے اخذ کیا ہے:

سراپا رہنِ عشق و ناگزیرِ الفتِ ہستی
عبادت برق کی کرتا ہوں اور افسوس حاصل کا

یہ شعر ہمارے قومی کردار کا مظہر ہے اور ہمارے اس مجبور واویلے کی قلعی کھولتا ہے، جو نتیجہ ہے، ہمارے شعوری طرزِ عمل کا۔ رشید امجد ایک روشن خیال، انسان دوست ادیب ہے، جو اشرافیہ میں سے ہونے کی بجائے اپنی نارسائیوں اور کمزوریوں کا اعتراف کرتے ہوئے براہِ راست اپنے مشاہدات اور تاثرات بیان کر دیتا ہے، جس سے

یہ کتاب شوق سے پڑھی جاسکتی ہے۔ وہ یہ چھپانے کی ضرورت محسوس نہیں کرتا کہ اسے سفر کے لئے متحرک کرنے کے لئے کسی بااختیار کردار کی ضرورت ہے:

''اکادمی ادبیاتِ پاکستان سے میر نواز سولنگی کا فون آیا کہ ادیبوں کا ایک وفد چین جارہا ہے، آپ جانا پسند کریں گے؟'' (چین سے چین تک ص:۷)

''اکادمی ادبیات پاکستان سے میر نواز سولنگی نے فون کیا کہ اکادمی سرحد، پنجاب اور بلوچستان سے ادیبوں کا ایک وفد اندرونِ سندھ بھیج رہی ہے، فخر زماں صاحب نے آپ کا نام تجویز کیا ہے، کیا آپ جائیں گے؟'' (اندرونِ سندھ چھے دن ص ۴۹)

''میری بیوی رخسانہ کو عمرے پر جانے کی عرصہ سے خواہش تھی۔'' (دل سے دل تک، ص:۱۱۱)

اسی طرح وہ یہ بھی چھپانے کی ضرورت محسوس نہیں کرتا کہ وہ بھی نظیر اکبر آبادی کے ہاں مذکور سفید پوش استاد ہے، اس لئے وہ بہت سے شاپنگ پلازا کو دور سے ہی دیکھتا ہے:

''دبئی مال بہت بڑا ہے۔۔۔ہم اندر نہیں جاسکے، کیونکہ ٹکٹ بہت مہنگا تھا۔'' (صحرا کی دنیا:ص:۹۹)..... ''میں نے ہارون سے کہا یار ہمیں شاپنگ مالوں میں گھمانے کی بجائے پوری امارات کی سیر کرا دو، ہم نے خریدنا وریدنا تو کچھ نہیں۔''.....(ایضاً، ص:۱۰۰)..... ''ہم سب بُرجِ عرب دیکھنے نکلے، یہاں بھی وہی معاملہ تھا کہ اندر جانے کا ٹکٹ بہت مہنگا تھا، اس لئے ہم جیسے لوگ ارد گرد سے ہی اسے دیکھ سکتے ہیں۔'' (ایضاً، ص:۱۰۱)

وہ بلاشبہ حرمِ پاک میں پہنچنے والے کچھ روحانی اور جسمانی فیوض کا ذکر کرتا ہے، مگر وہ یہ کہنے سے باز نہیں رہ سکتا:

''یہاں بھی وہی طبقاتی تضاد موجود تھا، کچھ ہوٹل ایسے تھے، جن کے دروازے صحنِ کعبہ میں کھلتے ہیں، ایسے ہوٹلوں میں ٹھہرنے والے اذان کی آواز اپنے کمروں میں سنتے ہیں اور نماز سے چند لمحے پہلے حرم میں آتے ہیں، ایسے ہوٹلوں میں صبح کا ناشتہ، دوپہر اور رات کا کھانا ہوٹل میں ملتا ہے، فریج ہر وقت مشروبات اور پھلوں سے بھری رہتی ہے مگر یہ اشرافیہ کے لئے ہیں دوسرے درجے میں ہم جیسے درمیانے طبقہ والے ہیں۔۔ہم سے ذرا نیچے والے ایسے ہوٹلوں میں تھے، جو خاصے فاصلے پر ہیں۔۔۔اور سب سے نیچے اچھی خاصی تعداد ایسے لوگوں کی تھی، جن کے پاس ٹھہرنے کی کوئی جگہ نہیں تھی، یہ لوگ صحنِ حرم کی دیواروں کے ساتھ لگے جنگلے میں اپنے بیگ لٹکا دیتے تھے اور سارا دن حرم کے اندر گزارتے ہیں اور رات کو باہر صحن کی دیوار کے ساتھ ساتھ سو جاتے ہیں۔۔۔میں نے صحنِ کعبہ میں کھڑے ہو کر خدا سے بار بار پوچھا ''اے ربِ عظیم! یہ کیا ہے؟'' لیکن مجھے کوئی جواب نہ ملا۔'' (ص ۱۱۶، ۱۱۷)

اسی طرح وہ برملا ذکر کرتا ہے عمرے کا انتظام کرنے والی اکثر پاکستانی کمپنیاں دھوکہ دیتی ہیں، ماجرا یہ ہے کہ کچھ عرصہ پہلے تک پاکستانی دنیا کے ان سادہ لوح مسلمانوں میں شمار ہوتے تھے، جو سرزمینِ حجاز میں خود سے ہونے والی بدسلوکی (اگر تذلیل کا لفظ سخت ہے تو) کو جنت کے حصول کے لئے ضروری خیال کرتے تھے، مگر میڈیا نے ہمیں اپنے زخموں کی نمائش کرنے کی عادت میں بھی مبتلا کیا ہے۔ (ہمارے بیچارے سابق وزیرِ حج کہتے ہیں کہ اس مرتبہ حج کے انتظامات میں کرپشن گذشتہ برسوں کے مقابل کم ہوئی ہے مگر واویلا زیادہ رہا۔) رشید امجد تو وہاں کے لوگوں کے طرزِ عمل پر بھی تنقید کرنے سے نہیں چوکتا، باقی ہمارے 'اپنے' سفارت کار، اہل کار اور خاص طور پر پی آئی اے کا عملہ تو ہے، پاکستان دشمن اور از کار رفتہ (مجھے احساس ہے کہ یہ قولِ متناقض ہے، جو از کار رفتہ ہو وہ دشمنی کے بھی قابل نہیں ہوتا)

> ''خود عربی بہت سست اور کام چور ہیں، گیارہ بجے سے پہلے سو کر نہیں اٹھتے، دفتروں میں صرف حاضری لگاتے ہیں' (ص:۱۰۲)..... ''ہم دبئی ایر پورٹ گئے (پی آئی اے کے) منیجر موجود نہیں تھے، معلوم ہوا۔۔۔ کہ انہوں نے یہاں چمڑے کی ایکسپورٹ امپورٹ کا کام شروع کر رکھا ہے۔۔۔ یہی حال اکثر و بیشتر سفارت کاروں کا ہے۔'' (ص:۱۰۹)

پاکستان کے چین سے خصوصی تعلقات رہے ہیں، بھٹو، ماؤ اور چو این لائی سے ہماری نسل کا باقاعدہ معاشقہ رہا ہے، مگر ہم ان کے معاشرے میں تہذیبی، معاشی اور فکری سطح پر ہونے والی دور رس تبدیلیوں سے زیادہ واقف نہیں رہے، رشید امجد اس معاشرے کو تحسین کی نظر سے دیکھتا ہے اور ڈاکٹر محمد علی صدیقی جیسے اپنے رفیقِ کار کے مشاہدات کا ذکر احترام سے کرتا ہے، اس کا اپنا رابطہ بھی بہت سے اردو کے چینی طالب علموں سے رہا ہے، مگر وہ ڈاکٹر طاہر تونسوی کی طرح انہیں چین میں تلاش کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کرتا البتہ وہ نئے چین پر معنی خیز تبصرہ بھی کر دیتا ہے:

> ''ابھی بہت سے ادارے ریاستی کنٹرول میں ہیں، ان میں ادب اور صحافت بھی شامل ہیں۔'' (ص:۲۲) ''ہمیں ایسی جگہوں پر نہیں لے جایا گیا، جہاں عام آدمی رہتے ہیں۔'' (ص:۱۸)
> ''غیر ملکی تاجروں کی آمد سے عیاشی کے ذرائع بھی فروغ پا رہے ہیں..... چین کی نئی نسل گلیمر کا شکار ہے، جس کے لئے اسے پیسوں کی ضرورت ہے، خصوصاً طالبات میں یہ رجحان تیزی سے بڑھ رہا ہے۔'' (ص:۳۲)

رشید امجد ایک کشادہ ذہن شخص ہے مگر ایک معصوم پنجابی کی طرح اداس ہو جاتا ہے جب کوئی سندھی یا بلوچ بآوازِ بلند اپنی محرومیوں کا ذکر کرتا ہے اور اس کی تلخ نوائی کا ہدف پنجاب بنتا ہے۔ چین میں بھی وہ اپنے ساتھی

سے محبت کے باوجود اس کی بعض باتوں کا آزردگی سے ذکر کرتا ہے، اور پھر سندھ کے دورے میں بھی اسے کچھ ایسی باتیں سننے کو ملتی ہیں، جنہیں ہم خود تنقیدی میں دہرا بھی دیتے ہیں مگر سننے کی ہمت کم ہی پاتے ہیں۔

اس کتاب کا حاصل وہ حصہ ہے، جہاں رشید امجد اپنی معصومیت میں باتیں کہہ جاتا ہے، جسے اپنے امیج کا خیال رکھنے والے ادیب ایڈٹ کر دیتے ہیں:

''معلوم ہوا کہ اتحاد ایرلائن کی۔۔۔ایر ہوسٹس شائستہ اور مہذب تھیں، روانی سے اُردو بول رہی تھیں، میں نے ایک سے پوچھا، آپ کی اردو بہت اچھی ہے، کہاں سے سیکھی ہے، ہنس پڑی بولی 'مَیں کراچی کی ہوں' (صحرا کی دُنیا، ص:۹۶) 'مدینے میں میرے ساتھ ایک ہاتھ ہو گیا، لگتا ہے مجھے دیکھتے ہی دوسروں کو احساس ہو جاتا ہے کہ آسانی سے بیوقوف بنایا جا سکتا ہے'' (ص ۱۱۹) دو دن پہلے رات کا کھانا کھاتے ہوئے بہت دیر بعد معلوم ہوا کہ ایک ڈش مینڈک کی تھی۔'' (ص ۴۴)

علی گڑھ جا کر جب وہ اس شہر نہیں اس کی جدید شناخت کو تشکیل کرنے والے کے آخری ایام کا ذکر کرتا ہے تو پڑھنے والا کسی قدر سوگوار ہو جاتا ہے:

''یہ وہی گھر ہے، جہاں سے سرسید کو بیماری کی حالت میں ان کے بیٹے سید محمود نے آدھی رات کو نکال دیا تھا، نواب محمد اسماعیل خان رات گئے گھر جا رہے تھے کہ انہوں نے دیکھا کہ ایک شخص کمبل میں لپٹا دیوار کے ساتھ لگا کانپ رہا ہے، اتر کر دیکھا تو سرسید تھے، تیز بخار میں کانپ رہے تھے، نواب اسماعیل انہیں اپنے گھر لے گئے، ایک دو دن کے بعد ان کا انتقال ہو گیا۔'' (پڑوس تک، ص:۹۰)

رشید امجد کی اس کتاب میں ایک تخلیقی شخص کو سرشار کرنے والے مناظر کی کمی بھی نہیں، جو داخلہ ٹکٹ کی گرانی ستائے شخص پر شب بیداری نازل کرتی ہے:

''رات دو بجے کے قریب۔۔۔مَیں نے پردہ ہٹا کر دیکھا، عجب منظر تھا، نیچے سڑک پر بھاگتی گاڑیوں کی روشنیوں کی نہ ٹوٹنے والی قطار اور سامنے سبز رنگ کا ایک تھال، سمندر کے پانی کا رنگ سبزی مائل ہو گیا تھا، تھوڑی دیر بعد میری بیوی اٹھ آئی، کیا دیکھ رہے ہیں؟ میں نے اشارہ کیا تو وہ مبہوت رہ گئی، ہم دیر تک اس منظر سے لطف اندوز ہوتے رہے۔'' (ص ۱۰۶)

پنڈی کے بارے میں بھی رشید امجد کی تحریر کافی موثر ہے، مگر یہ شہر اور اس سے رشید امجد کے لگاؤ کے گواہ اس سے بھی بڑھ کر اوراق کی تمنا رکھتے ہیں، وہ اس طرح کی بہت سے لمحات کی باز آفرینی کر سکتا ہے، مگر مصروفیات اسے یکسو نہیں کرتی ہوں گی اور عمر کے ان ایام میں اسے یکسو ہونا بھی نہیں چاہیے:

''ایک زمانے میں جب بری کے عرس پر طوائفیں آتی تھیں، تو ان کا پہلا مجرہ یہاں ہوتا تھا، جہاں مجھ ایسے لوگوں کے آنے پر کوئی پابندی نہیں تھی، ان دنوں صبح سویرے رقص کا آغاز ہوتا اور رات گئے تک یہ سلسلہ جاری رہتا، یہاں ایک خلوص اور پاکیزگی ہوتی، کیونکہ یہاں کوئی ویلیں نہیں

دیتا تھا، جبکہ بری کے عرس میں ایک کاروباری پہلو شامل تھا جس میں ایک جنسی ہوس پرستی بھی تھی۔' (یہ پنڈی ہے، ص: ۱۲۵)

❁❁❁

منڈلی (قاضی جاوید)

فکشن ہاؤس، لاہور: ۲۰۰۹ء

قاضی جاوید ایک ثابت قدم مگر جھینپو عاشق، ترقی پسند وجودی، صلح کل معرکہ آزما اور خوش خیال انسان ہے، جو کمزوری کے لمحوں میں بھی اپنے سر بکف ہونے اور رہنے کا خواب دیکھتا ہے مگر اپنے روایتی انکسار کی وجہ سے اس کی تعبیر تلاش کرنے کا ارادہ ملتوی کر دیتا ہے، اور اشفاق احمد کی اس عظمتِ کردار اور جراتِ گفتار کی تحسین پر اکتفا کر لیتا ہے کہ انہوں نے اپنے پسندیدہ ڈکٹیٹر ضیاء الحق سے یہ بات منوالی تھی کہ ایک پروگرام میں موسیقی بھی شامل کر لی جائے گی اور اپنے فکری استاد ڈاکٹر محمد اجمل کے گریبان میں ہاتھ ڈالنے والے اسلامی جمعیت کے سالار اور اب قومی سطح پر ایک اور 'با اصول' رہنما کے سنہری تذکرے سے گریز کرتا ہے۔ تاہم اس کے تراجم اور کتب کی مداحی کے سبب مجھے اس سے کم ملاقاتوں کے باوجود قربت کا دعویٰ ہے۔

قاضی جاوید نے اس کتاب میں اپنے ۲۵ فکری اور تہذیبی رفقاء کے خاکے لکھے ہیں، جن سے اُس کا رشتہ شاگرد، رفیقِ کار، مداح اور مسحور ناظر کا ہے، اُس نے ایک برس پہلے لکھے جانے والے دیباچے میں لکھا ہے 'ان دوستوں کی یادیں اس میں سمیٹی گئی ہیں، جو کبھی زندگی کی رونقوں کا حصہ تھے، منڈلی میں شامل تھے، پھر موت نے ان کو نظروں سے اوجھل کر دیا'۔ مگر میرا خیال ہے کہ امروز اور ڈاکٹر امریک سنگھ ابھی زندہ ہیں (تھے؟) جب کتاب شائع ہوئی۔ اس منڈلی میں جہاں فیض احمد فیض، علی سردار جعفری، صفدر میر، سی آر اسلم، اقبال احمد، عبداللہ ملک اور احمد ندیم قاسمی شامل ہیں بلکہ اس کے کیریر کے معمار خواجہ غلام صادق، ڈاکٹر سی اے قادر، ڈاکٹر محمد افضل اور ڈاکٹر محمد اجمل بھی ہیں، جن کے باہمی روابط قابلِ رشک نہیں تھے۔ ایسے سینئرز کے سامنے قاضی کی نگاہ روبرو بھی نہیں ہوتی، تاہم وہ کسی معصوم بچے کی طرح، جس سے شرارت تو کیا ذہانت کی بھی توقع نہیں ہوتی، جھکی اور مودب نظروں کے ساتھ ان کی ذات کے معنی خیز پہلو دیکھ لیتا ہے، جسے اُس کا فلسفیانہ ذہن اور زیادہ پہلو دار بنا دیتا ہے، یہ اور بات کہ پوری آسودگی بلکہ لطف آمیز آسودگی کے ساتھ اس منڈلی میں کسی کے ساتھ بیٹھتا ہے تو وہ منیر نیازی ہے۔ منیر نیازی کی فقرے بازی اُس کی اپنی احتیاط پسندی اور عافیت کوشی کا ازالہ کرتی ہے: 'مَیں نے اخبار میں شائع ہونے والے اُن کے انٹرویو کا ذکر کیا تو انہوں

نے اس کی مکرر اشاعت کو قاسمی صاحب کی 'شرارت' قرار دیا، جس کا مقصد ستارہ امتیاز کو رکوانا تھا۔ پھر کہنے لگے:

''مَیں اس شخص کا بیڑا غرق کر کے رہوں گا'۔۔۔۔۔امرتسر سے آنے والے ادیب بہت چالاک ہوتے ہیں، ان کی مونچھیں نہیں ہوتیں، مگر وہ تاؤ دیتے رہتے ہیں،۔۔۔۔شہزاد تو جان ایلیا کو بھی ستارہ امتیاز دلوانا چاہتا تھا، اب اس کو ستارہ جرات دلوادے۔۔۔ایک دن میں نے صدیق کلیم کو دیکھا، وہ ہارمونیم بجا رہا ہے اور منہ بند کر کے گا رہا ہے۔۔۔۔اشتراکیت نے ان کو (فیض کو) شہرت دی اور روزگار بھی، پر مجھے احساس رہتا ہے کہ وہ چھوٹے لوگوں کے ہجوم میں پھنس گیا ہے۔۔۔نقاد اصل میں اپنی بات کہتا ہے اور تخلیق کار کے کندھے پر بندوق رکھ کر استعمال کرتا ہے،۔۔۔ وہ چالاک آدمی ہوتا ہے، دوسروں کو استعمال کرتا ہے اور حیرت کی بات ہے کہ جن کو استعمال کرتا ہے، وہ اُلٹا ممنون بھی ہوتے ہیں۔۔۔ جب مَیں کسی کے اچھے شعر پر چُپ رہتا ہوں تو اندر سے پلیت ہو جاتا ہوں۔۔۔۔۔منیر نیازی مسکرا کر بولے دراصل آج امرتسر ٹی وی پر امریتا پریتم ایک پروگرام پیش کرے گی، کتنی خوبصورت عورت ہے۔۔۔آخر جب امرتا پریتم ان کا ذکر کئے بغیر رخصت ہو گئیں، تو منیر نیازی نے ٹی وی سے نگاہیں ہٹا کر پہلی بار دوستوں کو دیکھا اور گمبھیر لہجے میں بولے 'کتنی بدصورت عورت ہے، یہ!'' (منڈلی۔ص ۱۱۱۔۱۲۰)

اس منڈلی میں بیشتر وہ لوگ ہیں، جن سے قاضی کی براہِ راست ملاقاتیں ہیں، البتہ چند ایسے بھی ہیں، جن سے وہ ملا تو ضرور مگر بیشتر ان کی کتابوں اور تحریروں سے، جیسے ایلس فیض، این، میری شمل اور اینا مولکا۔ اس طرح وہ درمیانے طبقے کے اس پاکستانی خاکہ نگار کے مخمصے پر قابو پالیتا ہے، جو وہ ماں جی کے علاوہ کسی عورت کو قریب سے جاننے کا دعویٰ کر بیٹھے تو 'حدود' وغیرہ کے لاگو ہونے کی بحث بھی چھڑ سکتی ہے، شہرت بخاری غریب نے اپنی آپ بیتی میں اپنی دوسری بیگم کی حد سے زیادہ تعریف کر دی تھی، جسے غیر نظریاتی حاسدین کی نظر لگ گئی. قاضی جاوید اپنی کتاب میں ایک آدھ مقام پر مستنصر تارڑ سے پنجہ آزمائی کا سوچتا ہے، مگر جلد ہی جھینپ جاتا ہے:

''دوسرے روز پھر اس سے ملاقات ہوئی اور یہ سلسلہ پانچ سات دنوں تک جاری رہا، اس کا جنوں اتر چکا تھا اور وہ کم از کم نارمل ہو گئی تھی کہ جتنی اس واقعہ سے پہلے تھی، پھر ایک اتوار کی شام کو اس نے مجھے بہت سے ناول دیئے، اسی رات وہ ہوسٹل چھوڑ کر چلی گئی۔'' (ص ۲۵)

غالباً اسی دن سے قاضی جاوید نے کتاب بینی کو اپنا محبوب مشغلہ بنا دیا ہے۔ لاہوری ہونے کے باوجود اس کی طبیعت میں موجود انکسار، فلسفے کی تدریس، تازہ ترین کتابوں کو پڑھنے اور اپنی لذتِ مطالعہ میں شریک کرنے کی دھن، اکادمی ادبیات سے ایک طویل وابستگی (ادارہ ثقافتِ اسلامیہ سے تازہ ترین وابستگی) مگر سب سے بڑھ کر یہ کہ روشن خیال افراد کی یاد کو کہکشاں بنانے کی امنگ اس کی اس کتاب کو لاہور کا ایک ثقافتی غنائیہ بنا دیتی ہے۔ یہ

درست ہے کہ کہیں کہیں تکرار سے کام لیا گیا ہے، مگر یہ تو ڈاکٹر آفتاب اور احمد ندیم قاسمی کی یادداشت نما خاکوں کے ایسے ہی مجموعوں میں بھی ہے۔

قاضی، اُس تخلیقی مبالغے سے دور بھاگتا ہے، جو کسی خاکے کو زندہ اور رنگین بنا دیتا ہے، دوسرے وہ جونہی کسی کے بارے میں دلچسپ بات کرنے لگتا ہے، فوراً راوی یا راویوں کے نام بتانا شروع کر دیتا ہے، گویا ادبی تھانہ کچہریوں تک سے ڈرتا ہے، مگر وہ معنی خیز اشارے ضرور کر جاتا ہے، وہ صفدر میر کے احوال میں ایک مہربان خاتون کے ہاں اُن کے قیام کا ذکر کر کے یہ اشارہ بھی کر جاتا ہے کہ اپنے اہلِ خانہ سے وہ قطع تعلق کر چکے تھے، اب اس کلام پر حواشی کے لئے کسی حمید اختر کی ضرورت ہے۔ ''صفدر کی شادی گجرات میں اس کی کسی عزیزہ سے ہوئی تھی، مگر چند ماہ بعد ہی یہ رشتہ ختم ہو گیا۔۔۔۔ صفدر اپر مال میں ایک پارسی کنبے میں paying guest کے طور پر رہتا تھا۔'' (حمید اختر، 'پُرسشِ احوال'، روزنامہ 'ایکسپریس' لاہور، ۱۶ر جنوری ۲۰۱۰ء)، اسی طرح وہ امروز اور امریتا پریتم کے ایک ساتھ رہنے کے حوالے سے ایک غیر معمولی انکشاف کرتا ہے، مگر نہ خود کوئی شرارتی مسکراہٹ اپنے لبوں پر آنے دیتا ہے اور نہ کسی کو اپنے اظہار میں ملفوف انفرادی آزادی کے تصور سے لطف اندوز ہونے دیتا ہے۔ پھر شاید یہ بھی ہے کہ بیشتر خاکے ایک تعزیتی نوٹ کا درجہ رکھتے ہیں، جہاں مسکرانے کے لئے بہت ہمت درکار ہے۔

یہ اور بات کہ خالد حسن کی بے مثال کتاب 'مقابل ہے آئینہ' سے مجھ سمیت شاید بہت مبتدیوں کو اندازہ ہوا ہے کہ اسلوبِ زیست بننے والے فراد کے ساتھ اداروں اور شہروں کے بھی خاکے کس طرح لکھے جاتے ہیں، جن کے چاہنے والے بھی ہوتے ہیں اور انہیں دل و جان سے ناپسند کرنے والے بھی، حالانکہ ان کے پاس دل و جان ہو تو وہ انہیں کبھی ناپسند ہی نہیں کر سکتے۔ اصحابِ ذوق جانتے ہیں کہ خالد حسن نے اپنی کتاب میں ذوالفقار علی بھٹو، نور جہاں، سیالکوٹ اور پاکستان ٹائمز کے خاکے لکھے ہیں۔ سو قاضی جاوید کی کتاب 'منڈلی' پڑھتے ہوئے میری دلچسپی کا بنیادی نکتہ یہ بھی رہا کہ ایک تہذیبی خطہ لاہور رفتہ رفتہ نظریہ پاکستان ٹرسٹ میں کیسے تبدیل ہو گیا؟ فجے کے پائے، سردار کی مچھلی اور بابے کی قلفی نے ایسا کیا کیمیاوی عمل کیا کہ پاکستان کی روشن خیال دنیا کا ایک سرگرم مرکز کہاں گم ہوا۔

❁❁❁

یادیں اور باتیں (محمد کاظم)

سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور: ۲۰۱۰ء

احمد ندیم قاسمی کی یہ دل نوازی تھی کہ انہوں نے 'فنون' کے ذریعے چند ایسے منفرد اہلِ قلم جمع کر لئے تھے، جو سبھی کشادہ دل اور روشن خیال تھے، کتابوں کے رسیا تھے اور اپنے مطالعے اور مشاہدے میں خوش فکر لوگوں کو شریک کرنے کا اشتیاق اور سلیقہ بھی رکھتے تھے، ان میں علی عباس جلال پوری، محمد خالد اختر، محمد ارشاد اور محمد کاظم نمایاں ترین ہیں۔ محمد کاظم فنون کے اوراق میں عربی ادبیات کے ایک ایسے عالم کے طور پر سامنے آئے، جو عرب شاعروں کو افسانوی کردار بنانے کی حیرت انگیز صلاحیت رکھتے تھے، پھر وہ جرمنی میں دو برس کے لئے گئے اور وہاں سے ایک ایسا سفر نامہ لائے جو اردو میں بلاشبہ اپنے اسلوب میں منفرد ہے، اب سنگِ میل لاہور نے ان کے کچھ خاکے، کچھ ترجمے اور کچھ مضامین 'یادیں اور باتیں' کے نام سے شائع کئے ہیں۔

اس کے ہاں عام طور پر بشاشت اور رجائیت ملتی ہے مگر پرانے ساتھیوں کے خاکوں میں موت کا حوالہ تو آئے گا، جو ملال کا رنگ بھی پیدا کرے گا، مگر محمد کاظم اس لمحے کی فلسفیانہ تعبیر سے اسے زندگی کے بے انت معنی سے جوڑ دیتے ہیں:

> 'پانچ سال سے زیادہ عرصہ ہو گیا ہے، اب وہ خط میرے پاس نہیں آتا، جو ڈاک کے مربع شکل کے بڑے نیلے لفافے میں ہوتا تھا، جس پر کمزور ہاتھوں سے کی ہوئی خوش خطی سے میرا پتا درج ہوتا، یہ نیلا لفافہ کبھی تو مجھے اپنے مکان کے گیٹ کے اندر فرش پر پڑا ہوا ملتا اور کبھی جب میں باہر سے آتا، یہ میری میز پر دور سے دکھائی دیتا، اس نیلے لفافے کو دیکھتے ہی میرے دل کی کلی کھل جاتی اور زندگی یکلخت بامعنی لگنے لگتی، ۔۔۔۔ جب اپنے جگری دوست کے خط کا انتظار ہی باقی نہ رہا۔ تو یوں محسوس ہوتا ہے جیسے انسان بغیر کسی امید کے جئے چلا جاتا ہے' (ص: ۱۸۸، ۱۸۹)

اسی طرح وہ ہمارے ادبی منظر نامے پر طاقت کے مراکز سے کچھ علاقوں کی دوری کا افسردگی سے ذکر کرتے ہیں:

> 'بہاولپور کے ادبی منظر میں خواجہ غلام فرید کی ذات اب بھی روشنی کے مینار کی طرح تن تنہا کھڑی نظر آتی ہے، یہ بات نہیں کہ بہاولپور کا خطہ مردم خیز نہیں یا اس کی آب و ہوا کمال و ہنر کے ظہور کے لئے ناسازگار ہے، دراصل ایک خداداد جوہر بھی اپنے آپ کچھ نہیں کر سکتا، جب تک اسے اپنی تکمیل اور نمود کے لئے ایک خاص ماحول اور خاص فضا میسر نہ آئے، یہ ماحول اور یہ فضا ایک ترقی پذیر اور پیش رفت سوسائٹی میں میسر آ سکتی ہے' (ص: ۱۰)

یا پھر جب وہ سولژے نیتسن جیسے عظیم روسی منحرف ادیب کی اپنی وطن واپسی پر روسی ریاست اور حکومت کی

طرف سے اس کی پذیرائی کا تذکرہ کرتے ہیں (اس کی سات مختصر کہانیوں کے ترجمے کے ساتھ) تو پاکستان میں ان کی توقعات کے حوالے سے افسردگی کا تاثر ابھرتا ہے:

''چند سال ہوئے سولژے نتسن اپنے وطن روس میں واپس آ گیا، یہاں جون ۲۰۰۷ میں روس کے صدر ولادی میر پوتاں(putin) نے کریملن کی ایک پر رنگ تقریب میں اس کو ریاست کا چوٹی کا انعام عطا کیا، یہ انعام اس کی بیوی نتالیہ نے اس کی طرف سے وصول کیا اس لئے کہ ۸۸ برس کا ناتواں سولژے نیتسن یہ انعام لینے کے لئے خود نہیں جا سکتا تھا، پھر یہ ہوا کہ روس کے صدر پوتاں نے سولژے نیتسن کے گھر جا کر اسے اپنے ہاتھوں سے یہ انعام دیا، انعام دیئے جانے کی ایک تصویر میں صدر سے انعام لیتے ہوئے سولژے نیتسن ایک بوڑھا اور دانا انجیلی پیغمبر دکھائی دیتا ہے، ادب وفن کی قدر اُن ملکوں میں کیا ہے، یہ اس تصویر میں دیکھی جا سکتی ہے۔'' (ص ۵، ۶)

اس کتاب کے چار حصے ہیں: i. خاکے ii. عربی اور اسلامی ادب iii مغربی ادب، مغربی موسیقی iv. یادِ ایام

حقیقت میں پہلے اور آخری حصے کا باہم معنوی رشتہ ہے، کیونکہ اس میں بھی نہ صرف محمد خالد اختر کے بارے میں ان کی وفات پر ایک موثر بیانیہ ہے، پھر ان کے چار مکتوبات بھی کچھ ضروری توضیح کے ساتھ ہیں اور اپنی یادداشتوں کے کچھ اوراق ہیں، جب کہ خاکوں میں محمد خالد اختر کے علاوہ، احمد ندیم قاسمی، اختر حسین جعفری، علی عباس جلال پوری اور مختار مفتی کے بارے میں بے حد موثر تحریریں ہیں۔ حقیقت میں علی عباس جلال پوری بہت بڑے شخص تھے، مگر محبت اور عقیدت کے باوجود محمد کاظم نے لکھ دیا ہے:

''اس سارے مطالعے اور علم و دانش کے باوجود شاہ صاحب کی شخصیت اور مزاج میں ایک کمی محسوس ہوتی تھی اور وہ کمی تھی، رواداری اور لچک کی اور مخالف کی بات برداشت کرنے کی۔'' (ص ۳۰)

اسی طرح چند تکلیف دہ واقعات بھی لکھ دیئے گئے ہیں، خاص طور پر جب جلال پوری صاحب نے اختلافات میں محمد خالد اختر کو بھی لپیٹ میں لے لیا، احمد ندیم قاسمی کو محمد کاظم نے اپنی محفل کا صدر نشیں کہا ہے، اور ان سے احترام کا فاصلہ اس تحریر میں بھی دکھائی دیتا ہے، اس لئے وہ زندہ خاکہ نہیں بن سکا، کچھ یہی عالم اختر حسین جعفری کا ہے، شاید یہ سب وفات نامے ہیں، اس لئے قلم اور رسمی پیرایہ اختیار کر لیتا ہے مگر جہاں خاکہ نگار کی ذاتی قربت ہے، جیسے جلال پوری، یا خالد اختر یا پھر ادبی لحاظ سے ایک گم نام مختار مفتی کا، وہ بے حد موثر تحریریں ہیں۔ ان خاکوں میں مصنف کی شخصیت کا یہ دلچسپ پہلو بھی سامنے آتا ہے کہ وہ مصلحت یا دل داری کی خاطر بھی اپنے ادبی و فکری نقطۂ نظر میں لچک پیدا کرنے کے لئے تیار نہیں ہوتا اور وہ ایسے موقعہ پر گلیلیو کی طرح معصومیت سے آنکھیں جھپک جھپک

کے کہتا ہے 'میں کیا کروں، زمین گھومتی جو ہے'؟ مختار مفتی خلیل جبران کے عاشق تھے اور عربی ادبیات سے محمد کاظم کے لگاؤ کے سبب خواہاں تھے کہ وہ یہ کہیں کہ عربی زبان میں ان سے بڑا ادیب کوئی پیدا نہیں ہوا، مگر کاظم کہتے ہیں:

''مَیں ایک ایسی بات کیسے کہہ دیتا جو میرے نزدیک واقعہ کے خلاف تھی، جبران کو وہاں ادیب سے زیادہ ایک مفکر اور فلسفی تسلیم کیا جاتا ہے یا زیادہ صحیح طور پر نثر میں شاعری کرنے والا ایک صوفی منش! اس وجہ سے وہ عربی ادب کے مرکزی حلقے میں نہیں آتا اور اس سے کہیں بڑا ادیب اس کا وہ ہم وطن اور بچپن کا ساتھی میخائل نعیمہ ہے، جس نے اس کے سوانح لکھے۔'' (ص:۱۸)

تاہم وہ ملائمت سے اپنے دوست کی بعض کمزوریوں کا ذکر کر دیتا ہے۔ ''وہ کتابوں کے لین دین کے معاملے میں آزاد خیال تھا۔'' (ص:۱۸)

وہ اپنی نوعمری میں اپنے ہندو ہم مکتب سے اپنی دوستی پر مختار کی تہمت طرازی کو بھی ہنسی ہنسی میں اڑا دیتا ہے:

''وہ ہندو لڑکا خوب صورت ضرور تھا، لیکن مَیں خود ان دنوں عمر کی اس منزل پر تھا، جس میں انسان کو دوسروں کی طرف متوجہ ہونے سے زیادہ اپنا بچاؤ کرنے کی فکر ہوتی ہے۔'' (ص ۱۶، ۱۷)

عربی اور اسلامی ادب کے حصے میں مولانا محمد علی جوہر کے حوالے سے ایک چشم کشا بات لکھی ہے اور کبھی پاکستانی معاشرے کی بربادی کے اسباب پر کبھی سنجیدگی سے سوچا گیا تو معلوم ہوگا کہ اس کے لئے وسائلِ شرار مقدس لوگوں نے ہی فراہم کئے ہیں:

''انہوں نے موتمر کے بھرے جلسے میں ابنِ سعود کی موجودگی میں اپنی ٹوٹی پھوٹی عربی میں ایک پرزور تقریر کی کہ یہ ملوکیت کیسی؟ اسلام میں تو شخصی حکومت کی بیخ کنی کی گئی ہے، شوریٰ اور جمہوریت کو تفوق حاصل ہے، تم کتاب وسنت کے تمسک کے مدعی ہو، پھر یہ قیصر وکسریٰ کی پیروی کیوں؟ محمد علی کی تقریر پر سب لوگ ہکا بکا رہ گئے۔ سلطان کو اس موقع پر اتنی ناگواری ہوئی کہ وہ جلسے سے اُٹھ کر چلے گئے۔'' (ص:۷۵)

ادب کے طالب علموں کے لئے محمد کاظم کی نثر اس وقت ماڈل کا درجہ رکھتی ہے کہ کس طرح ایک انسان دوست اور روشن خیال عالم، مبالغے کے بغیر بھی عربی، انگریزی اور سرائیکی زبانوں کی تخلیقی کمک سے اُردو زبان کو ثروت مند بنا دیتا ہے، اس پر توجہ کی ضرورت بھی ہے اور اسے ایسی اجتہادی کوششوں کے لئے اکساتے رہنا چاہیے:

''میں اس کی طرح جبران کا دیوانہ تو نہ بن سکا، لیکن بر سبیلِ مفاہمت میں اسے کبھی کبھی پڑھنے ضرور لگ گیا، اسی طرح اُس نے ایک مقام پر نامختتم کی جگہ 'اَن کھٹ' کی ترکیب استعمال کی ہے، جو زیادہ بلیغ ہے اور اسے رواج دینے کی ضرورت ہے۔''

❁❁❁

ایک ٹکڑا دھوپ کا (اسد محمد خان)

القا پبلی کیشنز، لاہور: ۲۰۱۰ء

یہ اسد محمد خان کا نیا افسانوی مجموعہ ہے، جو ۲۰۱۰ء میں بہت خوبصورتی سے نفاست سے لاہور کے القا پبلی کیشنز نے شائع کی ہے، انتساب بیوی کے نام ہے، سادہ مگر آخری سفر کے لئے بظاہر راضی شخص کا ملال لئے ہوئے ’جن کی رفاقت میں یہ سفر آسان ہوا‘ کتاب میں بارہ (۱۲) افسانے ہیں، جن میں سے ۵ دانی کی کہانی، دھماکے میں چلا ہوا بزرگ، چھوٹے بور کا پستول، وارث اور کوکون (مکالمہ کراچی ہم عصر اُردو افسانہ۔۲، ص: ۱۵ تا ۷۹،) شائع ہو چکے ہیں۔

اسد محمد خان ایسے افسانہ نگار ہیں، جن کے پاس متنوع زندگی کا گہرا تجربہ، فطرت انسانی کا شعور اور اظہار کی بے پناہ صلاحیت کے ساتھ ساتھ تاریخ، تخیل اور معاصر زندگی سے لپٹی ہوئی پیچیدہ حقیقت کو بیان کرنے کے لئے نئے نئے فنی وسائل اور تکنیک تلاش کرنے میں ان کا ثانی کوئی نہیں ہے۔ افسانوی دنیا میں اُن کی شہرت پہلے مجموعے (کھڑکی بھر آسمان) سے ہی ہوگئی حالاں کہ اُس میں تیرہ (۱۳) افسانے شامل تھے تو اڑتیس (۳۸) نظمیں بھی مگر اس مجموعے میں شامل ’باسودے کی مریم‘، ’مئی دادا‘ اور ’ترلوچن‘ ایسے افسانے تھے جنھوں نے اُردو کے یادگار افسانوں میں جگہ حاصل کر لی۔ یہ تینوں کرداری افسانے ہیں پہلے دو تو گھریلو وفادار ملازموں کی قبیل کے وہ افسانے ہیں جن میں پریم چند کا ’قزاقی‘ بھی شامل ہے، اس میں شک نہیں کہ ایسے افسانوں میں جاگیرداری پس منظر کے حامل کنبے کے افراد (والدین) کو اور زیادہ عظیم المرتبت بنایا گیا ہے اور متکلم کے لیے بھی فخر کا یہ حوالہ موجود ہے کہ اُس کی تربیت میں عظیم قدروں اور رویوں کا دخل ہے مگر ’باسودے کی مریم‘ اور ’مئی دادا‘ غیر معمولی کردار ہوں گے، جنہیں یادگار بنانے میں اسد محمد خان کی کردار نگاری، فضا سازی اور مکالمہ طرازی کا گہرا دخل ہے۔ ’باسودے کی مریم‘ کو تو میں اُردو کے لازوال نعتیہ ادب میں سے خیال کرتا ہوں۔ ’ترلوچن‘ کراچی کی جھگیوں اور کچی آبادیوں کے دکھوں کے تخلیقی مداوے کے لیے ایک مثالی خیال طرازی ہے، اسد محمد خان مذہب کے نام پر منافقت اور استحصال کا مخالف ہے مگر ایک گہرا مذہبی اور متصوفانہ تجربہ اُس کے تخلیقی وجود میں ایسے رنگ بنا تا رہتا ہے جو اشفاق احمد، قدرت اللہ شہاب یا ممتاز مفتی کے لعاب آمیز رنگوں سے مختلف ہیں چنانچہ اس کے ہاں یہ موضوع معنوی گہرائی اور حسیاتی وسعت رکھتا ہے:

> ’’تمہاری اَنّا بُوا کی دوسری وصیت بھی پوری کرائی، عذاب ثواب جائے بڑی بی کے سر،
> میاں ہم نے تو ہرے بھرے گنبد کی طرف منہ کر کے کہٗ دیا کہ یارسول اللہ باسودے والی مریم فوت
> ہوگئیں، مرتے وخت کہہ رئی تھیں کہ نبی جی سرکار میں آتی ضرور مگر میرا امدو بڑا حرامی نکلا، میرے سب

پیسے خرچ کرا دیے۔'' (باسودے کی مریم، کھڑکی بھر آسماں، ص ۱۱۳) سو، اسد محمد خان کا گہرا داخلی تجربہ ہی اُسے اپنی تخلیقی کائنات میں جا بجا ملائیت کی دنیا کو لایعنی قرار دینے سے نہیں روک سکتا۔''

اسد محمد خان کی دوسری بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ تاریخ سے انسانی بصیرت کے لیے ایسے معنی کشید کرتے ہیں جو ایک طرف انسانی فطرت کو سمجھنے میں مدد دیتے ہیں اور دوسری طرف تاجداروں، غرض مندوں، سازشیوں اور جلسے جلوسوں کی زینت بننے والوں کی ظاہری اغراض کے پس پردہ یا متوازی، دھندلکے میں چھپی تمناؤں کو ایک وجدانی انکشاف بنا دیتے ہیں۔ اُردو افسانے میں قرۃ العین حیدر اور عزیز احمد نے اس حوالے سے یادگار افسانے لکھے ہیں۔ اسد محمد خان نے 'ایک سنجیدہ ڈی ٹیکٹو اسٹوری'، 'گھڑی بھر کی رفاقت'، 'نربدا'، 'رگھوبا اور تاریخ فرشتہ' اور 'ندی اور آدمی' جیسے بہت اہم افسانے لکھے ہیں۔ اوّل الذکر کا عنوان کافی غیر سنجیدہ ہے مگر یہ عمل اسد محمد خان کی جانب سے نستعلیقیت اور سنجیدگی پر ہر آن لعنت بھیجنے کے تصورِ حیات سے مطابقت رکھتا ہے، تاہم یہ اقتدار کے کھیل کے اندر آرزو، فریب، سازش، بے رحمی، باخبری اور لاعلمی کے سبھی عناصر کی ڈرامائیت پر مبنی ایسا افسانہ ہے جو عزیز احمد کے 'جب آنکھیں آہن پوش ہوئیں' اور 'خدنگِ جستہ' کے پائے کا ہے کہ اس میں تاریخ، تخیل اور عصری شعور سے بصیرت افروزی کا کام لیا گیا ہے۔ اسد محمد خان اس افسانے سے پہلے ایک نوٹ میں لکھتے ہیں:

''مغلوں سے پہلے- اور اُن کے بعد بھی- ناپسندیدہ سلطان یا ناپسندیدہ سلطانہ سے پیچھا چھڑانے کی راست صورت یہی سمجھی گئی کہ ایک سو ایک مروّج طریقوں میں سے کوئی ایک استعمال کرتے ہوئے اُسے ہلاک کر دیا جائے- تلوار سے یا پھانسی دے کے، وِش کنّیا سے ہم بستری کرا کے یا مور کے پَر سے تلووں میں گدگدی کرتے ہوئے- جیسے بھی بن پڑے۔ ذاتی طور پر مصنف اِن تمام ایک سو ایک طریقوں کے حق میں ہے مگر کیوں کہ یہ کہانی مزاحمت کرنے والے کے نقطۂ نظر سے سوچی گئی ہے، اس لیے فی الحال یہ مصنف رسمی معذرت پیش کرتے ہوئے کہانی سنانا شروع کرتا ہے۔'' (ایک سنجیدہ ڈی ٹیکٹو اسٹوری، غصے کی نئی فصل، ص ۱۷۱)

اس افسانے کا اختتام بے حد معنی خیز ہے جو ہر دَور کے شخصی حکمرانوں کے گرداگرد خوشامد، سازش، عقیدت اور نفرت کے جال بننے والوں اور اقتدار کو طول دینے کے حریصوں کی معصومانہ بے رحمی کا ایسا نقش اُبھارتا ہے جسے خیال اور زیادہ رنگین، پیچیدہ اور قابلِ فہم بنا دیتا ہے:

''اور ایسے ہی ایک اور تاریک کمرے میں ایک اور فراخ کرسی میں ٹانگیں پھیلائے بیٹھا ایسا ہی ایک اور ہیولا خوشامد میں چہچہا رہا تھا اور دریا اور شادی سے کہیں زیادہ عالی منزلت ایک نَر تاج دار (یا شاید وہ مادہ تھی) کو آمادہ کر رہا تھا کہ رعایا پر گرفت رکھنے کے لیے کیا یہ مناسب نہ ہوگا کہ بعض عمائدِ مملکت کو عطر اور لباس کے تحائف دیئے جائیں؟ یا برتنوں کے تحفے؟ اور مواصلت کے لیے بہ

حکمت تیار کی گئی نا کتخدا عورتوں کے تحفے؟ کس لیے کہ ان اشیا سے متعلق حکمت اس خانہ زاد کے پاس فی الوقت موجود ہے۔ اور اس خدائی خوار عمارت کے ہزار خدائی خوار کمروں کی تاریکی سے جیسے سمجھو چڑیوں کی آوازیں چلی آ رہی تھیں، جب شام پڑے وہ کنجوں میں شور کرتی اور چہچہاتی ہیں۔ اور یہاں یہ کہانی ختم اور شروع ہوتی ہے۔'' (ایک سنجیدہ ڈی ٹیکٹو اسٹوری، غصے کی نئی فصل، ص ۲۰۰)

اسی طرح 'گھڑی بھر کی رفاقت' ('برجِ خموشاں') میں ایک طبع زاد کہاوت ''مسافرت میں ایک وقت ایسا بھی آتا ہے جب گھوڑا اپنے سوار کی راسیں سنبھال لیتا ہے'' کی معنویت کو تاریخ کے پردے پر پھیلا کے ایک ڈرامائی منظر تشکیل دیا ہے، جس میں اِس نکتے کو اُجاگر کیا گیا ہے کہ سازشی کے تحفے سے قربت بھی آپ کو اپنے رنگ میں رنگ سکتی ہے۔ 'رگھوبا اور تاریخِ فرشتہ' تو اس حوالے سے ایک حیرت انگیز افسانہ ہے، جس میں تاریخ، تہذیب، تصوف اور علم البشر افسانہ نگار کے تخلیقی تخیل سے ہم آہنگ ہو کر اُردو کا ایک یادگار افسانہ تخلیق ہوا ہے جس کی فضا سازی اور تخلیقی زبان اسد محمد خان کی انفرادیت کو ظاہر کرتی ہے۔ دو اقتباسات دیکھیے:

ا) ''ہر پارچے کی کور پر بڑی حکمت سے لکھا ہوتا ہے خاص برائے ملک حسن خان پسر ملک شادی خان عماد الملک ہندی۔ وہ مجھے خوشامد میں ملک لکھتے ہیں جو میں نہیں ہوں اور مجھے عماد الملک کا بیٹا بتاتے ہیں جو میں نہیں ہوں، مگر یہ مجھے اچھا لگتا ہے اور مجھے بہترین فرانسیسی مشروب اور خوبصورت عورتوں کے جھرمٹ میں گلگشت اچھی لگتی ہے، میں اپنے لیے ملک نائب کی مسند پسند کر چکا ہوں، جہاں اس وقت کافور ہزار دیناری بیٹھا ہے، رگھوبا میرے بھائی تیرے ساتھ جانے اور ٹھوکریں کھانے سے تو بہتر ہے کہ میں گرم حوض میں بیٹھ کر جراح سے اپنی دونوں کلائیوں کی وریدیں کھلوا دوں اور خوش الحان گویوں کا راگ سنتے ہوئے ہمیشگی کی نیند سو جاؤں۔ نا، نا، میرے بھائی! میں ایسی کسی بھی موت، کسی بھی زندگی کے لیے تیار نہیں ہوں، جو میرے شایان نہیں۔'' (رگھوبا اور تاریخِ فرشتہ، نربدا اور دوسری کہانیاں، ص ۷۵)

ب) ''صد شکر کہ میرے ہادی، میرے مرشد نے بروقت مجھے صلاح دی، فرمایا کہ اپنی اصل سے تُو چوڑی ساز ہے اور آہنگروں، نجاروں، چوڑی سازوں کے ہاتھ جو بھی بناتے ہیں اپنی زیبائی میں وہ سلطنتوں سے بڑھ کر ہیں۔ اس طرح میرے مرشد نے اُس آزار سے کہ جسے جاہ و حشمت طلبی کہا جاتا ہے مجھے دُور رکھا، تو اَب میں، پنج دیناری غلام اپنا بُلاوا آنے تک اِس مخفی حُجرے میں بیٹھا ہوں اور بے مثل ونگیاں، چوڑیاں، لاکھ کے کڑے بنائے جاتا ہوں، بنائے جاتا ہوں اور جانے کو تیار ہوں۔'' (ایضاً، ص ۹۱)

اسد محمد خان میں ڈرامہ بنانے اور ڈرامہ لکھنے کی بے پناہ صلاحیت ہے، یو۔ پی، پنجاب، سرحد اور کراچی

میں آباد متنوع انسانوں کے ہر لہجے کی بازیافت تخلیقی سطح پر کرسکتا ہے، پھر اُس کے مشاہدے، تجربے، مطالعے اور تخلیقیت نے اُسے اتنا رنگا رنگ مواد دیا ہے جو اُس کے بہت کم معاصرین کو نصیب ہوا ہے مگر دو تین چیزیں ایسی بھی ہیں جو ناقدین کو معائب کے طور پر دکھائی دیں گی جن سے اسد محمد خان اجتناب برتیں تو پھر وہ اسد محمد خان نہ رہیں۔ اُس کے افسانے 'نربدا' کا آغاز دیکھئے:

''ابھی کوئی کہتا تھا کہ ساؤنت اور دلاور ختم ہوتے جارہے ہیں۔ Endangered Species میں سے ہیں۔ یہ بھی سنا تھا کہ بالکل ختم ہوگئے، ڈوڈو پرندے کی طرح۔ اور اگر کہیں اُن کا ذکر ملتا ہے تو بس افسانوں کہانیوں میں۔ مارکیٹ اکونومی اور کنزیومرازم اور احتیاج اور ازلی خودغرضی اور خونی بواسیر اور ریموٹ کنٹرول نے اُنہیں بالآخر نمٹا دیا، اس لیے اُن پر اصرار کرنا Anachronism پر اصرار کرنا ہے۔'' (نربدا، نربدا اور دوسری کہانیاں، ص ۱۱)

اب اگر اسی کو اس طرح سے لکھ دیا جائے:

''ابھی کوئی کہتا تھا کہ ساؤنت اور دلاور ختم ہوتے جارہے ہیں، اگر کہیں اُن کا ذکر ملتا ہے تو بس افسانوں کہانیوں میں۔ مارکیٹ اکونومی اور کنزیومرازم اور احتیاج اور ازلی خودغرضی اور خونی بواسیر اور ریموٹ کنٹرول نے اُنہیں بالآخر نمٹا دیا۔'' تو اِس میں غصے سے خونی بواسیر کو بھی اسباب میں شامل کرنے والا اسد محمد خان موجود رہے گا اور اس طرح افسانے کا آغاز کسی تنقیدی مضمون جیسا نہیں ہوگا۔ دوسرے اسد محمد خان اُن لوگوں میں سے ہیں جنہیں انہدام یا ردِتشکیل سے تخلیقی دلچسپی ہے اس لیے وہ اچانک اس طرح کے فقرے بھی لکھ جاتے ہیں جو افسانے کی فضا کی کبھی ضرورت ہوتے ہیں اور کبھی نہیں ہوتے۔ جیسے: ''لڑکی جس نے اپنا نام صنوبر جاہ لکھا تھا، سر اُٹھا کر اُسے دیکھنے لگی پھر اُس نے سطر مکمل کی نیچے دستخط کیے اور وہ پرزہ اہل کار کی طرف بڑھا دیا، بلند آواز سے کہنے لگی، ''نقرئی سکوں سے خریدے گئے جھوٹے معافی ناموں کے ساتھ میری یہ فریاد رکھ دینا اور سلطان تک یہ بات پہنچا دینا کہ وہ اپنے عم زاد محمد تغلق کے لیے صرف دُعائے خیر کرے..... چاندی خرچنے سے مغفرتیں نہیں ملتیں۔'' (ص ۱۸)

''پیش امام نے کرسی پر بیٹھے بیٹھے گہری سانس لی جیسے خود کو کسی آزمائش کے لیے تیار کر رہا ہو پھر پھنسی ہوئی آواز میں بولا، 'عورت تجھے نہیں معلوم کہ تو کن شیطانی اثرات کے تحت ایک دین دار آدمی سے منھ ماری کر رہی ہے۔ اے بدنصیب میں نے تو تیری اصلاح کے لیے یہ تحریک کی تھی۔ خدا جانتا ہے کہ اس میں نفسی خواہش کا شائبہ بھی نہ تھا۔ اس وقت میں جارہا ہوں مگر میری بات پر ٹھنڈے دل سے غور کرنا۔ اے ناقص العقل! میں تو۔'' (ص ۶۷)

''میں وکیل عون محمد ہوں، اس وقت وکالت نامے پہ پندرہ سالہ موکل کے دستخط لے کر

اپنے دفتر جا رہا ہوں۔'' (ص ۶۸)

''اصل میں پولیس نے کاکے کے خلاف Blasphemy کا کیس درج کیا ہے۔ مجھے ڈر ہے کہ لوگ اُسے جان سے نہ مار دیں..... ہوا یہ تھا کہ کاکے نے محلے کے پیش امام کی جلتی ہوئی لالٹین پہ غلیل میں پتھر رکھ کے مار دیا تھا تو حجرے میں آگ پھیل گئی تھی جس سے پیش امام کی نئی واسکٹ، ایک پیلا رومال اور کچھ برکتوں والے کاغذ ضائع ہو گئے تھے۔ جن پر رحمتوں والا پاک کلام چھپا ہوا تھا۔ اسی وجہ سے وہ لوگ بے حرمتی کا پرچہ کٹوانے میں کامیاب ہو گئے۔ مگر مجھے یقین ہے کہ آخر کو سچ سامنے آئے گا اور کاکا بری ہو جائے گا۔'' (ص ۶۹)

''مصنف کے منھ کو خون لگ ہی چکا تھا اُس نے اپنے fan جنرل ضیاء الحق (طے شدہ شہید اور آخری جنگِ یو ایس ایس آر کے غازی) سے فرمائش کی کہ ٹی وی پر سلیم احمد سے میری فلاں ناول بھی کرا دو۔ جنرل صاحب نے اُس جنرل سے جو ٹی وی بٹھایا گیا تھا، کہلا بھیجا۔'' (ص ۸۵)

پاکستانی معاشرہ جس طرح تشدد، تفتیش اور خودکشی کی لپیٹ میں آیا ہے اور ایک کانٹریکٹ اور پیکج کے عوض خدمات انجام دینے والی اشرافیہ کی تہذیب اور لب ولہجہ 'فری مارکیٹ اکانومی' کی کہیں غلام گردشوں میں رکھ دیا گیا ہے، ساتھ ہی ساتھ ہی خود کو حکمتِ عملی کے ماہر سمجھنے والوں نے جو پاکستان کے خود ساختہ نظریاتی، تہذیبی اور جغرافیائی 'محافظ' بھی ہیں، اہلِ پاکستان کو لاپتہ کرنا شروع کیا ہے، یہ گم شدہ لوگ یا ان کے تفتیش خانوں میں ہیں، یا ان کے آقاؤں نے ہی خرید لئے ہیں، جو باقی بچے ہیں، وہ جرائم کی زیرِ زمین دنیا میں ہیں، انہیں بردہ فروشوں نے انہیں ماں باپ سے جدا کر دیا ہے، اب انہیں کوئی لوری اور کہانی سنانے والا نہیں، اب اگر کسی کی آنکھ میں ہمدردی نظر آتی ہے تو وہ لیاری کا کالا شیر اللہ بخش ہے، یا پھر قبروں میں لیٹے وہ لوگ جنہوں نے ان کی امیدوں کا قاتل بننے کے لئے خودکش جیکٹ پہن رکھی تھی۔ اسد محمد خان شاید اُردو کا وہ واحد افسانہ نگار ہے، جس نے 'لاپتہ' ہونے والے بلوچوں کے بارے میں لکھا ہے اور جو کراچی میں رزق کے لئے ریزہ چینی کرنے والی ہر قومیت کی زبان ہی نہیں سمجھتا بلکہ ان کے احساس کو بھی سمجھتا ہے، اپنے اس تازہ افسانوی مجموعے میں شامل اس کے بعض افسانوں کے اقتباسات دیکھئے: 'میری ماں یا بہن بھائی ہوتے تو بھوت پریت کے قصے سناتے، جن لوگوں نے مجھے پالا، انہیں کہانیوں، قصوں کا وقت ہی نہیں ملتا ہوگا، اس لئے میں اس سائے کو آدمی ہی سمجھا' (دانی کی کہانی ص ۶۳)..... 'اب میں اپنی یادگار تُربت میں جندہ دبا دیا گیا ہوں (شہید کی جو موت ہے، وہ قوم کی حیات ہے) اور کئی کنگنی اواجوں والوں بڈھوں سالوں کا مرشد شہید بنا دیا گیا ہوں جو میری کنڈی کھڑکا کے پوچھ رہے ہیں کہ سر! ہم لوگ ابھی ادھر بیٹھیں کہ چلے جائیں؟ ٹھیک ہے اس وقت لیٹنا اور عقیدت مندوں مریدوں کی آرا دھنا سنتے رہنا ہی مناسب ہے، ہاتھا پائی شور شرابے سے کوئی فائدہ

نہیں۔اوبئ دھما کا کر کے مرا ہوا بجرگ بننے کے الگ ہی اپنے مجے ہیں۔'(دھما کے میں چلا ہوا بزرگ،ص۱۰۳).....
''ہم لوگ لا وارث نئیں ہے صاب !ہاں یہ رستے کا آدمین، یہ اوٹھ والا ساربان، گوٹھ گاؤں قصبے کا لوگ،شہری مہری، یہ سب کم زور بھلیہی ہوویں، پران کوخبر ہے کہ بئ تم لوگ ہم دوکو پکڑ کے لے جارئے ہو،ابھی بھوک پیاس میں، بندوق کا بٹ مارنے سے یا گولی چلانے سے ایک دوقیدی کم ہوجاوے تو بات چھپ نئیں سکیں گا سر!۔۔۔اور یہاں اکبرعلی کھوسا کی کہانی جتنی کہ مجھے معلوم ہے،ختم ہوتی ہے،کس لئے کہ پولیس لائنز پہنچنے کے بعد مجھے یا کسی اور کو پھر اس کی کوئی خبر نہ مل سکی،تاہم بے گنتی بلوچ اور بے شمار وہ جو بلوچ نہیں ہیں،اُسے لاوارث نہیں مانتے۔''(وارث،ص:۲۹،۲۸)

اس کتاب کا پہلا افسانہ 'قافلے کے ساتھ ساتھ' ہے، جو تاریخ کے ساتھ اُس کے تخلیقی رومان کو ظاہر کرتا ہے، مگر اُس کی ساری کوشش کسی معنی خیز لمحے کی باز آفرینی کی ہے کہ ہماری ہند مسلم شخصیت کی اجتماعی یادداشت میں جھانک کر کچھ نفسیاتی گرہیں بھی سلجھائی جاسکیں۔'سیرک مہتر نے صحیح وقت پر اس عورت سے بیاہ نہ کرلیا ہوتا تو وہ اب تک تیس چالیس دفعہ مارا گیا ہوتا'(ص:۳)'کسی جمعے کی نماز میں سلطان کے قریب کی صف میں جگہ لے لینا،امام جب سلام پھیرے تو اونچی آواز سے اپنی شکایت سنا دینا، دیر نہیں کرنا، ورنہ خوشامدی منہ بند کر کے ہاتھ پکڑ کے مسجد سے باہر کردیں گے، تیرے ساتھ جو ہونی ہے، وہ ہوگی، ادھر کے امیرِ حبش کی طلبی ہوجائے گی۔'(ص۱۹)

افسانے کے فن میں ساری قوت فضا سازی میں ہوتی ہے، جسے تخلیقی فقرے زندہ کرتے جاتے ہیں اور اسد محمد خان کا یہی کمال ہے، چند مثالیں دیکھئے:

> ''مردوں کا حال یہ تھا کہ اُن میں کا تقریباً ہر ایک، یا زیادہ تر اپنی ازکار رفتہ زنانی پر نچھاور ہوا جاتا تھا۔''(داروکا اڈّہ،ص۵۹).....''ایک زبردست سفید سر سیدی داڑھی والے سردار جی کی روغنی تصویر۔''(مدھوری بائی کی ادھوری کہانی،ص:۱۲۶).....''وہ آپ کو گھر پر تو ملے گا نہیں، گیدڑ کی طرح ہوشیار ہے سُوور!''(ہمسائے،ص:۱۶۵)

❁❁❁

نوبیل ادبیات (باقر نقوی)

اکادمی بازیافت، کراچی: ۲۰۰۹

شاعر نے تو اپنے نام کی مناسبت سے اپنی آپ بیتی کو 'جہانِ دانش' کہا تھا، مگر میرے نزدیک یہ کتاب حقیقت میں جہانِ دانش و حیرت ہے۔ اس کے مترجم اور مرتب بلاشبہ عزیز احمد، حسن عسکری، محمد سلیم الرحمٰن، ستار طاہر، قاسم محمود، جمیل جالبی، ہادی حسین، کشور ناہید، قاضی جاوید، اجمل کمال، انیس ناگی، فہمیدہ ریاض اور خالد سعید جیسے اصحابِ علم و ادب کی صف میں شامل ہیں، جنہوں نے اردو زبان کو اپنے تراجم سے کسی قدر ثروت مند بنایا ہے۔ باقر نقوی شاعر ہیں، سائنسی اور عقلی موضوعات سے عملی دلچسپی رکھتے ہیں اور اردو زبان میں حکمت و دانش و ہنر کو منتقل کرنے کے لئے مضطرب ہیں اور انہیں حق پہنچتا ہے کہ وہ اس کتاب کے انتساب کے طور پر یہ فقرہ لکھیں: 'ہماری پیاری قومی زبان اُردو کیلئے، لوگ جیسے تنگ داماں سمجھتے ہیں'۔ باقر نقوی نے لکھا ہے: 'یہ کتاب دراصل بیسویں صدی میں ادب کا نوبیل انعام پانے والوں پر مشتمل ہے، سب سے پہلا انعام ۱۹۰۱ء میں دیا گیا تھا، انعام پانے والی ہر شخصیت کا ایک باب ہے، جس میں سب سے پہلے اس کی زندگی، تعلیمی اور ادبی کوائف کی تالیف کی کوشش کی گئی ہے کہ اس کا بہت مختصر تعارف ہو جائے، اس کوشش میں ان تقریروں سے بھی استفادہ کیا گیا ہے جو نوبیل اکادمی کی طرف سے انعام کے سلسلے میں کی گئی تھیں' [ص: ۱۸]، ایک صدی میں جن ۹۶ تخلیق کاروں اور مفکروں کو یہ انعام ملا، ان میں سے بیشتر کے خطبات کے تراجم کے ساتھ ساتھ، رسمی ضیافت میں کی جانے والی تقریر اور سوانحی کوائف بھی اس کتاب میں موجود ہیں۔ میرے نزدیک یہ صرف گذشتہ ایک صدی کے بہترین ادبی خطبات کا مجموعہ نہیں بلکہ متنوع ثقافتوں اور سیاسی منظرناموں میں دنیا کی سب سے زیادہ نفیس اور منزہ روحوں کا کلام ہے۔ مَیں نے خود پر جبر کر کے محض چند خطبات کے جزوی حوالے دینے پر اکتفا کیا ہے:

منحرف چینی ادیب: گاؤ ژینگان، جو فرانس میں مقیم ہیں، جنہیں ۲۰۰۰ء میں نوبیل انعام ملا

'ادیب زبان پر انحصار کرتا ہے، اس لئے زیادہ دیر تک نہ بولنا ایسا ہی ہے جیسے خودکشی کر لی گئی ہو، جس نے خودکشی سے اجتناب کیا۔۔۔ اس کے پاس سوائے ترکِ وطن کے اور کوئی راستہ نہیں ہوتا تھا' [ص: ۲۴] 'کسی سائنسی نظریہ پسندی کے ذریعے تاریخ کی صفائی پیش کرنا یا تاریخی تناظر میں اس کی تشریح کرنا، جس کی بنیاد نقلی علمِ کلام پر ہو، دونوں ہی انسان کے رویوں کی صفائی پیش کرنے میں ناکام رہے ہیں' [۲۹] 'ادب کا مقصد تہ و بالا کرنا نہیں ہوتا، اس کی خوبی ہے انسان کی دنیا کو دریافت کرنا اور انکشاف کرنا' [۳۰] 'تہذیبی انقلاب کا زور ادب کو پامال کرنے

پر تھا، ادب مرا نہیں اور ادیب تباہ نہیں کیے گئے، کتابوں کی الماریوں میں ہر ادیب کی جگہ ہے اور اس کی حیات اس وقت ہے، جب تک کہ اس کے قاری موجود ہیں' [۳۲]

جرمن ناول نگار گنتر گراس، ۱۹۹۹ء میں نوبیل انعام پانے والے

'میری والدہ کے [منظورِ نظر] عم زاد، پولینڈ کے ڈاک خانے کے کلرک کو گولی ماری گئی اور دفنا دیا گیا مگر مَیں نے اسے قبر سے نکالا اور ادبی تنفّس کے ذریعے دوسرے نام اور اجنبی بھیس میں زندہ کر دیا' [ص:۴۲] 'اکثر ایک ادبی وہم اس تصور کو راسخ کر دیتا ہے کہ سچ صرف جمع میں ہوتا ہے، اکیلا سچ ہوتا ہی نہیں' [۴۳] 'جس طرح نوبیل انعام کی جڑیں بھی ڈائنامائٹ کی ایجاد میں پیوست ہیں، انسان کی دوسری بڑی کامیابیوں، جیسے ایٹم کے ٹکڑے کرنا اور جین کی نوبیل نما درجہ بندی، دونوں نے دنیا کی خوش حالی اور اندوہ سے بھر دیا ہے، اسی طرح ادب کی جڑوں میں بھی ایک دھماکے ایک تاخیری عمل کا اثر رکھتے ہیں' [۴۸] 'مفلس بڑھتی ہوئی دولت مندی کا مقابلہ بڑھتی ہوئی شرحِ پیدائش سے کرتے ہیں۔' [۵۰]

داریوفو، اطالیہ کے ڈرامہ نگار، (۱۹۹۷ء)

'ایک ہی وار میں ان مجنون صفت لوگوں نے ترک تہذیب کے سب سے اہم رہنماؤں کو ختم کر دیا تھا، ہزاروں طلبہ ہم کو سن رہے تھے، ان کے چہرے حیرت کے جذبات سے تمتما رہے تھے، انہوں نے اس قتلِ عام کے بارے میں سنا بھی نہیں تھا، سب سے زیادہ حیرت مجھے اس بات پر ہوئی تھی کہ اساتذہ اور پروفیسر حضرات بھی اس واقعے سے ناواقف تھے۔' [۷۴]

وسلاوا سمبورسکا، پولینڈ کی شاعرہ (۱۹۹۶ء)

'شاعر کی خواہش ہوتی ہے، اس کو پڑھا جائے اور اس کو سمجھا جائے مگر وہ نہ خود کو عوام سے بالاتر سمجھتے ہیں اور نہ شب و روز کی چکی سے باہر' [۸۲] 'کبھی کبھی مَیں ان کیفیتوں کے خواب دیکھتی ہوں، جن کے سچ ہونے کا امکان نہیں ہوتا' [۸۵]

کینزابورواوئے جاپانی ناول نگار (۱۹۹۴ء)

اپنے پیش رو کاواباتا یاسوناری کا ذکر' کاواباتا اپنی ذہنی کیفیت کو قرونِ وسطیٰ میں جین جوگیوں کی لکھی نظموں کے روپ میں پیش کرتا ہے، 'ان میں سے زیادہ نظمیں سچ کہنے کے سلسلے میں لسانیاتی بے امکانی پر تفکر کرتی ہیں' [۱۰۹] 'ایک سو بیس برس کی سر سے پاؤں تک تجدید کے بعد موجودہ جاپان ابہام کے دو متضاد اور مقابل قطبین

کے درمیان بٹا ہوا ہے۔ جاپان ایشیا میں ہے اور اس نے اپنی روایتی تہذیب کو اپنی مٹھی میں سختی سے تھام رکھا ہے، جاپان کے ابہام زدہ رجحان نے اس کو ایشیا پر حملہ آور جیسا بنا دیا ہے'[۱۱۲] 'مَیں جاپانیوں کی مبہم خصوصیات کے متضاد قطبین کے درمیان بٹ چکا ہوں، مَیں کوشش کرتا رہا ہوں کہ ادب کے ذریعے اس درد اور زخم سے شفایاب بھی اور بحال بھی ہوسکوں۔۔۔ میرے ذہنی طور پر معذور بیٹے ہیکاری کو پرندوں کی آوازوں سے لے کر باش اور موتسارت کی موسیقی نے ذہنی اعتبار سے بیدار کیا ہے، اب وہ خود اپنی موسیقی ترتیب دے سکتا ہے۔۔۔ جوں جوں ہیکاری موسیقی کے مزید ٹکڑے ترتیب دیتا گیا ان میں مجھے کسی تاریک روح کی چیخوں کی آوازیں بھی سنائی دینے لگیں، ذہنی طور پر معذور جیسا کہ وہ تھا، ہیکاری کی جاں فشاں کوشش نے اس کی موسیقی کی ترتیب کی ہنرمندی میں یا اس کی زندہ رہنے کی عادت میں ارتقا کا ایک سرایت کرنے والا تصور پیدا کر دیا، اس تصور نے اسے وہ طاقت عطا کر دی جس نے وہ اپنے قلب میں پوشیدہ گہرے غم کو دریافت کرنے کے قابل ہو گیا، جس کو وہ الفاظ کے ذریعے بیان کرنے کی قدرت نہیں رکھتا تھا'[۱۱۶]

اوکتاویو پاز، میکسیکو کا شاعر (۱۹۹۰ء)

'زبانیں ایسی وسیع حقیقتیں ہوتی ہیں، جو ان سیاسی اور تاریخی وحدتوں پر اترتی ہیں، جنہیں ہم قوم کہتے ہیں۔۔ زبانیں دراصل مقامی مٹی میں پیدا ہوتی ہیں اور ایک مشترکہ تاریخ ان کو غذا مہیا کرتی ہے، یورپی زبانوں کے پودے اپنی مقامی مٹی میں اور اپنی روایت سے اکھاڑ کر نامعلوم اور بے نام دنیا میں دوبارہ لگائے گئے، انہوں نے نئی زمینوں میں اپنی جڑیں پیوست کیں اور امریکہ کے معاشرے میں نشو ونما کے ساتھ ان کی کایا پلٹ ہو گئی۔۔ ہمارے ادب نے پیوند شدہ زبانوں کے بدلتے ہوئے مقدر کو سر جھکا کر تسلیم نہیں کیا۔'[۱۶۴]

نجیب محفوظ، مصر (۱۹۸۸ء)

'میرے نزدیک ایک عظیم سلطنت بنانے یا اہرام تعمیر کرنے سے زیادہ اہمیت ہوتی ہے، انصاف کی'[۱۹۴] 'مَیں اس دنیا سے آیا ہوں، جو اتنے قرضوں کے بوجھ تلے محنت مزدوری کر رہی ہے، صرف جن کی ادائیگی پر اٹھنے والا والا خرچ ہی اس کو فاقہ مستی یا اس سے قریب تر رکھتا ہے، بہت سے لوگ ایشیا میں سیلاب کی نذر ہو جاتے ہیں، جب کہ کچھ افریقہ میں قحط کا شکار ہو جاتے ہیں۔۔ [فلسطینیوں کو اپنا حق مانگنے کے سوال کا] جواب ٹوٹی ہوئی ہڈیوں، گولیوں سے چھلنی جسموں، مسمار شدہ مکانات اور جیلوں اور عقوبت خانوں میں اذیتوں سے دیا جا رہا ہے، ان کے چاروں جانب ڈیڑھ ارب عرب غصے اور غم کی کیفیات میں سب کچھ ہوتا دیکھ رہے ہیں، اگر اس کو ان لوگوں کی دانش کے ذریعے بچایا نہیں گیا جو ایک منصفانہ اور مکمل امن کے خواہاں ہیں تو یہاں شدید تباہی پھیلے گی'[ص ۱۹۵] 'اگر

نوعِ انسانی کی کراہ کی بازگشت، آپ کے تمدّن کے نخلستان میں جہاں اُس [الفریڈ نوبیل] نے ہر پودا سائنس، ادب اور ارفع انسانی قدروں کے لئے لگایا گیا ہے، نہ گونجے تو اس کو اور کون سی جگہ ملے گی۔۔ معافی اور درگذر کی امید میں، ہم تیسری دنیا کے بچے صاحبانِ حیثیت سے، صاحبانِ تمدّن سے مطالبہ کرتے ہیں کہ وہ بھی اس کے نقشِ قدم پر چلیں۔۔ تاکہ اس کی پیش بینی پر مراقبہ جاری رہے' [۱۹۷]

گیبرئیل گارشیا مارکیز، کولمبیا، (۱۹۸۲ء)

'ہم ہسپانوی سلطنت کے غلبے سے تو آزاد ہو گئے مگر ہسپانویوں کے پاگل پن نے ہمارا پیچھا نہیں چھوڑا۔۔ پانچ جنگیں ہوئیں اور سترہ فوجی بغاوتیں، جن کے نتیجے میں ایک شیطانی خصلتوں والے آمر کا ظہور ہوا، جس نے ہمارے زمانے میں خدا کے نام پر لاطینی امریکہ کا پہلا فرقہ وارانہ قتلِ عام کیا،۔۔۔ یہ صرف شاعرانہ اظہار ہی نہیں، حقیقت سے کہیں بڑی حقیقت ہے کہ انہی وجوہ کی بناء پر سوئیڈش اکادمی کی توجہ [لاطینی امریکہ] کی طرف مبذول ہوئی ہے۔ شاعر ہو یا فقیر، موسیقار ہو یا پیشین گو، جنگجو ہو یا بدمعاش، بے لگام حقیقتوں کی تمام مخلوق، ہم سب کا بنیادی مسئلہ یہ ہے کہ ہم اپنی زندگی کو قابلِ یقین بنانے کے لئے آپس میں ابلاغ کے لئے مروجہ طریقوں کے استعمال سے اجتناب کرتے رہے ہیں تو دوستو یہی ہمارے گوشۂ تنہائی کا عقدۂ لا ینحل ہے' [۲۸۲۔۲۸۳] 'ہماری تاریخ میں موجود بے پایاں تشدد اور درد، ایک عرصے پر محیط ناانصافیوں اور ناقابلِ بیان تلخیوں کا نتیجہ ہے، مگر بہت سے یورپی دانش وران پرانے لوگوں جیسے طفلانہ انداز میں سوچتے ہیں، جو عنفوانِ شباب کی اپنی ثمر بار زیادتیوں کو بھول جاتے ہیں' [۲۸۴]

پابلو نرودا، چلی (۱۹۷۱ء)

'میَں نے کسی کتاب سے نظم لکھنا نہیں سیکھا تھا۔۔ اس طویل سفر میں مجھے نظم لکھنے کے لئے ضروری مواد مہیا ہو گیا، کچھ تو زمین سے ملا اور کچھ روح نے دیا' [۳۷۵] 'کسی شاعر کے دشمن نہیں ہوتے سوائے اس کی اپنی کمزوریوں کے، جس کی بناء پر اس کے درماندہ اور فراموش کردہ ہم عصر اس کو سمجھ نہیں پاتے' [۳۷۶] 'ان غلطیوں نے جو مجھے سچائیوں کی طرف لے گئی ہیں اور ان سچائیوں نے جو بار بار مجھے غلطیوں کی طرف لے گئی ہیں مجھے اجازت نہیں دی۔۔ کہ میَں رہنمائی کا راستہ تلاش کروں، یہ سیکھنے کی کوشش کروں کی تخلیقی عمل کیسے ہوتا ہے، ادب کی ان بلندیوں تک پہنچنے کی کوشش کروں، جن تک رسائی دشوار ہوتی ہے، مگر مجھے ایک بات کا احساس ہوا ہے کہ وہ ہم ہی لوگ ہیں، جو اپنی اسطور سازی کے ذریعے بلاؤں کو دعوت دیتے ہیں' [۳۷۷]

الیکزاندرایساوچ سولژے نیتسن، روس(۱۹۷۰ء)

’فن ایک یخ بستہ اور دھندلائی ہوئی روح کو بھی مشتعل کر کے ایک بلند روحانی تجربے سے دوچار کرتا ہے، فن کے ذریعے دھیرے دھیرے،ہم پر ایسے انکشافات ہوتے ہیں، جو منطقی سوچ سے پیدا نہیں ہو سکتے۔‘[۳۸۴]’تُف ہےاس قوم پر جس کا ادب طاقت کی دست اندازی سے درہم برہم ہو جاتا ہے۔‘[۳۹۰]’عالمی ادب ایک بڑے دل کی طرح دنیا کے افکار اور مشکلات پر دھڑکتا ہے۔‘[۳۹۴]’تشدد کو پناہ صرف کذب ہی میں ملتی ہے۔‘[۳۹۶]

ولیم بٹلر ییٹس (آئرلینڈ ۱۹۲۳ء)

’دیہات میں آپ اپنے تشدد کے ساتھ تنہا ہوتے ہیں، اپنی اداسیوں کے ساتھ اور زندگی کے مشترک المیوں کے ساتھ اور اگر آپ میں کسی قسم کی جمالیاتی صلاحیت ہے تو آپ حسین جذبات کے خواہش مند ہوتے ہیں۔۔شہر میں جہاں ہر شخص آپ پر چڑھا چلا آتا ہے، اپنے آپ سے نہیں، اپنے پڑوسی سے نفرت کرتے ہیں اور اگر آپ اس کی اور اپنی زندگی میں تلخیاں نہیں گھولنا چاہتے شاید کسی انقلابی جذبے کے باعث طیش میں آ کر آپ اس کو قتل بھی نہیں کر دیتے تو کسی نہ کسی کو حقیقت اور انصاف کی تعلیم تو دینی ہوگی، پھر کچھ دیر کے بعد آپ اس معلمِ اخلاق سے نفرت کریں گے۔‘[۶۷۰]

اناطول فرانس، فرانسیسی (۱۹۲۱ء)

’کیا یہ عجیب بات نہیں کہ سب سے خوف ناک جنگوں کے بعد جو امن کے معاہدے ہوئے وہ دراصل امن کے لئے نہیں، بلکہ جنگوں کو جاری رکھنے کے لئے تھے۔‘[۶۸۷]

❁❁❁

چین آشنائی (شاہ محمد مری)

سانجھ پبلی کیشنز، لاہور: ۲۰۰۷ء

وہ بولان میڈیکل کالج میں پروفیسر ہے، شارعِ فاطمہ جناح پر شاہ لیب ہے، جہاں مریضانِ ادب وانقلاب کا جمگھٹ ہوتا ہے اور وہ خود اپنے جیسے بے مثال رسالے 'سنگت' کی کاپیاں پھیلائے ڈاک کے لئے مفت خوروں کے نام اور پتے لکھ رہا ہوتا ہے، ساتھ ہی ساتھ وہ تین کتابیں بھی لکھ رہا ہوتا ہے، ایک تو راہِ وفا کا سلسلہ ہے، بلوچستان کے ان مشاہیر کا تذکرہ جن کا احترام پاکستان بھر کے ترقی پسند کرتے ہیں، غوث بخش بزنجو، گل خاں نصیر، عبداللہ جمال دینی، انہی کے ساتھ سی، آر، اسلم پر بھی اس کی کتاب ہے، پھر بلوچ سماج میں عورت، بلوچ مری جنگِ مزاحمت، مستیں توکلی اور جانے اور کیا کیا، دوسری طرف وہ کسی نوجوان تخلیق کار کو بڑھاوا دے رہا ہوتا ہے کہ وہ اپنی تخلیقات کا مجموعہ لے آئے، اسے دوسروں کی کتابیں خرید کر پڑھنے کا جو شوق ہے، اس کی عشرِ عشیر توفیق بھی اس کے مداحوں کے پاس نہیں، وہ ایک بے چین روح ہے، گذشتہ دنوں جرمنی سے ایک مشترک دوست نے کچھ ناراض بلوچوں کے حوالے سے مجھے ای۔میل بھیجی کہ اپنے دوست شاہ محمد مری سے کہو، اپنی جان کی خیر منائے ہمیں وفاقِ پاکستان سے اُس کے رابطے پسند نہیں، تب مجھے یاد آیا کہ ابھی جب مَیں عبداللہ جمال دینی کے حجرے میں انہیں کمالِ فن ایوارڈ پر مبارک باد کہنے گیا، تو ان کے گرد بیٹھے نوجوانوں کے ابروتن گئے۔

شاہ محمد مری کا اسلوب منفرد ہے، مگر اُس سے لطف لینے کے لئے کشادہ قلبی اور تربیتِ ذوق کی ضرورت ہے، اس لئے مَیں نے شعوری طور پر تبصرے کے لئے اس کا سفرنامۂ چین 'چین آشنائی' منتخب کیا ہے، جو ایک طرف اس کے افکار ونظریات کا مظہر ہے اور دوسری طرف پاکستانی اُردو کے لئے مستقبل کے اظہاری امکانات کا بے پناہ ذخیرہ ہے، ایک مثال دیکھئے، جب ہم کسی کو ناراض ہو کر نظرانداز کرنا چاہ رہے ہوتے ہیں تو کافی ناشائستہ اور متشدد الفاظ میں اظہار کرتے ہیں، مثلاً 'دفع کرو'، ''گولی مارو'، 'لعنت بھیجو' سرائیکی اور پنجابی میں تو ہم اسے تھوک 'مارنے' کی بات کرتے ہیں، مگر ہمارا پیارا شاہ محمد مری ہمیں بتاتا ہے کہ ایسے موقعے پر بلوچی میں کہتے ہیں 'بابا اسے پھول مارو'، اسی طرح جب وہ اپنی تحریر کو بلوچی اور پشتو ضرب الامثال سے سجاتا ہے تو ایک جہانِ معنی پنجاب یا کراچی میں بسنے والے اُردو کے طالب علم کے سامنے آتا ہے، جیسے 'ملاؤں میں بھی مسلمان ہوتے ہیں'، 'دو بھائی، تیسرا حساب' (بلوچ کہتے ہیں اگر تم دو بھائی ہو تو خود کو تین کہتے رہو اور تیسرے کا نام باہم 'حساب کتاب' ہے (ص ۶۹) یا 'خدا گھڑی میں گھڑیال بجا دیتا ہے' (ص ۴۹)

اُس نے حسبِ عادت بڑی سنجیدگی سے چین کی تاریخ، کلچر اور سماج میں آنے والی تبدیلیوں کا ذکر کیا ہے

اور باقاعدہ ہر باب کے آخر میں ماخذات کے حوالے دیئے ہیں،مگر وہ اول وآخر بلوچ ہے، جو اپنی بے ساختہ اور شگفتہ اردو کے ذریعے ہمیں باور کرانے کی کوشش کراتا ہے کہ غیر بلوچستانی،ابھی اپنی قومی ثقافت،تاریخ اور مشاہیر کے بارے میں زیادہ نہیں جانتے،اسے فخر ہے کہ وہ مہرگڑھ کا ہے، جو دنیا بھر میں تہذیب وتمدن کے اولیں گہوارے کا درجہ رکھتا ہے مگر پاکستان سٹڈیز کے نام پر ضیا سٹڈیز پڑھنے والوں نے تو ابھی موہنجوڈارو، ہڑپہ اور ٹیکسلا کی معنویت پر غور نہیں کیا،انہیں چولستان کے گنوریری والا یا بلوچستان کے مہرگڑھ کا کیا پتہ؟۔ڈاکٹر مری اپنے مصلحت سوز اسلوب میں لکھتا جاتا ہے:'اژدہے چینی کلچر میں بارش کے فرشتے بھی تصور کئے جاتے ہیں۔۔(ان کا بارش کا فرشتہ ہم بلوچوں والے فرشتے کی طرح سال کے بارہ مہینے سویا نہیں رہتا)(ص:۶۵)'ایک اور صاحب ملے جو ریڈیو بیجنگ میں اردو پروگرام کے سربراہ ہیں۔۔۔یہ صاحب ہمارے دوست ایوب بلوچ کے شناسا نکلے،انہوں نے ان کو بہت سارے سلام بھی کہے مگر ہم ایک عرصہ گزر جانے کے باوجود ان تک نہ پہنچا پائے کہ وہ سیکرٹری گیری کو اپنے دونوں ہاتھوں، پیروں، دانتوں سے پکڑے جکڑے ہوئے ہیں اور سیکرٹریٹ کے سیاہ خانے میں ہمارا جانا نہیں ہوتا، روشنی اور آکسیجن میں وہ نہیں نکلتے'(ص:۲۲۶)'اس جہاز میں ضیاالحق کا فلسفہ یوں مکمل طور پر نافذ تھا کہ یہاں مرد ہی مرد مہمان نوازی کررہے تھے،ایرہوسٹس آگے حلال کمائی والی کلاس کو جلوے اور حلوے بانٹ رہی تھیں'(ص:۶)'ہر سرکار سیرت کانفرنسوں اور مشائخ کانفرنسوں کے نام پر ہر قوم کے ملاؤں اور پیروں کے میٹنی شو یہاں منعقد کرتی رہتی ہے'(ص:۱۹)'جب لوک ورثہ نامی ادارہ بنا تو تمام استادیوں کے باوجود وہاں لیاقت علی کا شیروانی اور محمد بن قاسم کے سندھ پر یلغاری لشکر کے یونیفارم بچ نہیں پائے،لہٰذا مجبوراً ہماری قومی ثقافتوں کو پیش کرنے کا تلخ آب ہمارے مالک طبقات کو پینا ہی پڑا'(ص:۱۹)'چین میں عوام کی واضح اکثریت کسی مذہب کو سرے سے مانتی ہی نہیں۔۔علامہ اقبال کے فلسفے کے بالکل الٹ وہاں دین وسیاست پچاس برس سے جدا جدا ہیں،مگر اس کے باوجود سارے نظریۂ پاکستان والے نوائے وقتیے اس چنگیزی والے ملک کی تعریفیں نہیں کرتے تھکتے۔۔گو کہ ضیا دور میں حمید گل والوں نے سنکیانگ میں مودودی صاحب کی کئی ٹن کتابیں سمگل کروائی تھیں'(ص:۶۱)'ہماری معزز میزبانیہ(گم کرو مذکر مونث کو) نے ہمیں ہمارے وطن کے کھانے کھلائے(ص:۲۲۷)'ان چینی لڑکیوں میں اس قدر خوبصورتی ہے کہ عقل دنگ رہ جائے،آپ انار دانے کی چمک بھول جائیں، میں لال کی لالی بھول جاؤں گا۔۔نور،عرش کا نور، پری قاف کی پری،کبوتری قلندر کے دربار کی کبوتری'(ص:۲۴۵)

ڈاکٹر شاہ محمد مری نے اس سفرنامے میں ایک اپنا نسائی ہم زاد اپنے خواب وخیال میں ساتھ رکھا ہے،وہ اس کی موجودہ یا موعودہ بیوی بھی ہوسکتی ہے مگر اس نے بلوچ کلاسیکی شاعری اور اساطیر میں اس کردار کو ایسا رچا لیا ہے

کہ وہ افسانوی کردار بن گیا ہے، جہاں کہیں وہ چین کی گڑیوں کی توصیف کرنے لگتا ہے، یہی ہم زاد اسے انتباہ ہی نہیں کرتا بلکہ طعنے بھی دینے لگتا ہے، اس سے ایک اور دلچسپ بات بھی سامنے آتی ہے کہ بلوچستانی عورت کو اپنے مرد کے لئے ڈیرہ غازی خاں کی عورت سے خطرہ رہا ہے' اسی نگراں نے اپنی مقدس مترنم آواز میں اپنا ہی شعر گایا

پہ دیرو ءِ گندہ عادتیں رناں
سمل ءِ عہداواں نہ بھورنیاں (ص:۱۳۹)

شاہ محمد مری نے یہ سفر اکادمی ادبیاتِ پاکستان کے تعاون سے کیا اور اس میں اُس کے ساتھ دیگر لوگوں کے ساتھ ساتھ مشتاق احمد یوسفی، ڈاکٹر سلیم اختر اور اظہار الحق بھی تھے، یوسفی صاحب بڑی معصومانہ سنجیدگی سے پھلجھڑیاں چھوڑتے ہیں، شاہ محمد مری نے ان کے ایسے تبصروں کو بڑی محبت سے محفوظ کرلیا ہے، خاص پر جب ڈاکٹر سلیم اختر کے گرد جمع ہونے والی ایک دو ضرورت مند لڑکیوں کو انہوں نے عقیدت مند خیال کیا اور حقیقت کھلنے پر اپنی وجاہت پر محمول کیا۔

❁❁❁

کُھل جا سِم سِم (نوشابہ نرگس)

امتیازِ ادب، ملتان: ۲۰۰۸ء

ہمارے تخلیق کاروں نے عام طور پر چاہا کہ کوئی خاتون ان کی مرہونِ منّت ہوئے بغیر شاعرہ نہ ہو سکے، اس لئے کسی بھی شاعرہ کو نہ صرف اپنے جوہرِ سخن کو منوانے میں دقّت کا سامنا ہوتا ہے، بلکہ تکریم یا اعتبار پانے میں بھی وقت لگتا ہے، مگر نوشابہ نرگس نے ساٹھ کی دہائی کے گورنمنٹ کالج ملتان سے ایم۔اے اُردو کرتے ہوئے اور پھر 'امروز' ملتان کے دفتر میں اکلوتی خاتون کارکن کے طور پر جس طرح اردگرد موجود نگاہوں اور زبانوں کی تربیت کی، وہ قابلِ تعریف ہے، اس میں ایک حصہ اس کے خاندانی پس منظر کا بھی ہے۔ ممکن ہے کہ اس طرح کی احتیاط اور فاصلہ نے ان کے تخلیقی وجود سے ایک دو جمالیاتی اور جذباتی عناصر منہا کر دیئے ہوں یا وہ وقتی طور پر جدا ہو گئے ہوں اور جن کی بازیابی کے لئے وہ تخلیق کے اس اسمِ اعظم کی تلاش میں رہی کہ وہ اعتماد سے کہے کھل جا سم سم اور تمام مقفل شدہ امانتیں پھر سے چم چم کرتی اور نوخیز عمر کے طرارے بھرتی آموجود ہوں۔

اس کے اس مجموعے میں زیادہ تر نظمیں ہیں، موضوعاتی اور قومی شاعری کے بعد اردو نظم نے جس نئے پیرایۂ بیان کو اپنایا، اس میں ابہام کا دخل اس لئے بھی ہوا کہ نظم گو نے شعوری طور پر اپنا مخاطب خود کو بنایا، یا پھر ایک

آدھا اپنے جیسے ہم زاد کو، یہ اور بات کہ زمانے کی کروٹوں اور عالمی ادب کے تراجم کی پذیرائی نے ایسی فضا بنادی کہ چار عشرے پہلے مبہم قرار دی جانے والی شاعری توجہ سے پڑھی جانے لگی، یہ اور بات کہ نوشابہ نرگس کا تعلق شاعرات کے اس زمرے سے ہوسکتا ہے، جو یہ نہیں چاہتا ہو کہ ان کی تخلیقات کو منظوم آپ بیتی خیال کیا جائے، دوسرے اس کی پیشہ ورانہ اور سماجی ذمہ داریوں نے اسے کم از کم ملتان ایسے روایتی خطے میں رہنے والی تعلیم یافتہ خواتین کی خود اختیار کردہ تنہائی کے محرکات [انا، کسی کی قربت سے وابستہ واہمے، پسندیدہ شخص کی متبادل ترجیحات اور سب سے بڑھ کر یہ کہ خواب و خیال میں بے باکی اپنی جگہ مگر جیتی جاگتی زندگی میں باوقار خاموشی میں لپٹی اظہار کی نارسائی] سے واقف ضرور کیا ہوگا، اس لئے اس کی منظومات کی شعری فضا محض ایک ذی روح کی کہانی سے مرتعش نہیں ہوتی، اور یہ فضا ایک مخصوص سماج میں پروان چڑھنے والے نسائی تخیل اور احساس کی مظہر ہے، اس کی تخلیقی کائنات میں غالب پیکر تو، ظاہر ہے کہ نسائی ہے، مگر کہیں کہیں اس کے مردانہ ہم زاد یا رفیق کی بہت فاصلے سے کسی قدر مضطرب پرچھائیں بھی ملتی ہے، تاہم ایک دو مقامات کو چھوڑ کر اسے اذنِ کلام نہیں ملتا۔ اپنی کلیدی نظم 'کھل جا، سم سم' کے آخری حصے میں جب شاعرہ کہتی ہے 'چاندنی رات کے سناٹے میں

ہم تم مل کر
کوئی تصویر بنائیں ایسی
اپنی چپ میں جو کرے لاکھ سخن
بے صدا شور میں آپ اپنی کہانی کہہ دے
ایک آزار۔۔۔ سے چھوٹیں ہم تم' [ص:۲۰]

تو یہ 'آزار' کیا ہے، خود، زندگی؟ نارسائی؟ یا کفّارے کا بوجھ؟ یا پھر عورت کے نگہبانوں کی جانب سے تربیت کے نام پر فرامین کے پُشتارے سے رہائی؟ جس کے بارے میں وہ اپنی ایک نظم 'آسیب کا جنگل' میں اشارہ کرتی ہے:

'اوس میں تم باہر مت آنا
لان میں ننگے پاؤں نہ پھرنا
جگنو تم کو لاکھ بلائے
تاریکی میں راہ دکھائے
چاند ستارا

ہولے ہولے دستک دے کر
پیار بھرا پیغام سنائے
کچھ مت سننا
دل کچھ اور کہانی مانگے۔۔۔سمجھا دینا
کمرے سے باہر کی دنیا
کچھ بھی نہیں ہے۔۔۔اک آسیب کا جنگل ہے'[ص:۲۲]

اسی طرح ہم زاد بھی تخلیق کار کے آئینۂ ذات کا عکس بن جاتا ہے، مگر ایک دوسرے کو رہائی دلانے سے قاصر:

'کہانی کار ہے وہ بھی
کہانی مَیں بھی لکھتی ہوں
عجب فن کار ہیں دونوں
سبھی کی بات کرتے ہیں
کبھی۔۔۔اپنی نہیں کہتے'[ص:۲۶]
'اس گھڑی سے اُس گھڑی تلک
بس۔۔ایک دو ہی پل کا فاصلہ رہا۔۔
مگر۔۔۔عجب یہ ہوا، کہ آئینہ ہی بلبلِ ہزار داستاں ہو گیا'['بلبلِ ہزار داستان'ص:۲۱۸]

نوشابہ کے ہاں اک عجیب بات حروفِ نفی کا بکثرت استعمال ہے، چند نظموں کے عنوانات ہی دیکھئے:

'نوحہ نارسائی کا'، 'مطمئن ہونے نہیں دیتی'، 'نامہرباں لمحے سے پہلے'، 'کچھ یاد نہیں کرنا'، 'خواہشِ ناتمام'، 'نایافت'، 'نامکمل فیصلہ'، 'ناموجود لمحہ'، 'وفا کا موسم نہیں بدلتا'، 'نادانی'، 'بے سبب نہیں'، 'گواہی سچ نہیں ہے'، 'لاحاصل'، 'بے عنوان'، 'تم نہیں آئے'، 'معلوم نہیں'۔ اسی طرح بعض اچھی نظموں کا انتساب انہیں محدود کر دیتا ہے، جیسے 'گل بکاؤلی' کے آخر میں درج ہے والدِ محترم کے نام، یا 'زندگی، اے زندگی' کو سانحہ لال مسجد کی بھینٹ چڑھایا گیا، 'نامکمل فیصلہ' عدلیہ کی آزادی کے نام ہے، اور 'عورت' یومِ خواتین سے منسوب ہے۔

دو نظموں کا مَیں بطور خاص ذکر کرنا چاہتا ہوں، ایک تو save or delete میں پہلی مرتبہ شاعرہ نے نسائی قالب کو کسی قدر سرشار ہو کر 'دُلار' کرنے کی اجازت دی ہے کہ پہلی مرتبہ وہ نام نہاد تہذیبی قرینے کے حصار سے نکل کر 'چلے گا' جیسے آزاد اور بے تکلف الفاظ کو ادا کرے اور بڑے اعتماد اور بانکپن سے سوال کرے:

یہ ممکن ہے کہ ہم دنیا کو یکسر بھول جائیں
خود اپنے آپ میں تعمیر کر لیں
حسیں یادوں کا مندر۔۔۔تاج یا تم نام۔۔جو بھی دو
چلے گا۔۔
مجھے بس یہ بتا دو
جو لوحِ دل پہ ہے تحریر اب تک
اسے محفوظ کر لوں
یا مٹا دوں[ص:۸۳]

اور دوسری نظم 'کیہہ جاناں، مَیں کون' ہے، یو پی کی ایک تربیت یافتہ خاتون پنجابی کے اس عظیم شاعر کی چوکھٹ تک کسی نغمے کے سحر کے زیرِ اثر پہنچیں یا پھر حجابات کے گھونگھٹ اُٹھا کے، یہ پریم پجاری خود اس منزل تک آ پہنچی، گیت نما نظم کی فضا ایک والہانہ بے اختیاری کا پتا دیتی ہے:

'کوئی تو میرا نام بتائے
کام ہے کیا، آ کر سمجھائے
گھر اپنے کی راہ نہ پاؤں
ڈھونڈ پھر چوندیس
من کا پنچھی بے کل ایسے کونج کوئی بن ڈار
بلہیا۔آ کر اب تو آپ بتا دے
دوار کھڑی مَیں کون
بلہیا کیہہ جاناں، مَیں کون؟'[ص ۲۲۷، ۲۲۸]

اتفاق سے کئی عشرے پہلے جب نوشابہ ملتان کے مشاعروں میں شرکت نہیں کرتی تھی، تو اُس کا تعارف ریڈیو پاکستان، ملتان کی ایک معروف مغنیہ ناہید کی سریلی آواز کے ذریعے غزلوں سے ہی ہوا تھا، مگر اب احساس ہوتا ہے کہ اس کی بطور تخلیق کار اصل شناخت نظموں کے حوالے سے ہی ہے کہ غزلیں ان کے دورِ تربیت کو ظاہر کرتی ہیں اور ان چند پختہ کار شاعروں کی صدا بھی اس نگار خانے میں گونجتی ہے، جنہیں ایک نومشق نے ماڈل کے طور پر رکھا ہوگا، مگر کہیں کہیں ہماری ملاقات اس مجموعے کی خالق سے بھی ہو جاتی ہے، چند ایسے شعر دیکھئے:

سنو ،گر فاصلے لکھنا سمجھ کر سوچ کر لکھنا
فقط اک لفظ کافی ہے،ذرا سی بدگمانی کو

رات کے پچھلے پہر کچھ جگنوؤں کے درمیاں
کہکشاں سمٹی رہی بس اب بکھر جائے ذرا

نسوانی تمثیل نے اس شعر کو پرکشش بنادیا:

وہ اختصار کی حد پر ٹھہر گیا آ کر
ہم ایک لفظ میں ساری کتھا سنا آئے

لگا رکھا ہے اک خوابوں کا میلہ
مرے دن رات کی کیا پوچھتے ہو؟

کب سے ہے اس شہر کو اک اجنبی کا انتظار
پر یہ مشکل ہے،اسے پہچانتا کوئی نہیں

کہانی مختصر، چرچا بہت ہے
ذرا سی بھول، خمیازہ بہت ہے

کچھ بات کرو ہو نہ اشارات کرو ہو
مہمان کی خوب اپنے مدارات کرو ہو

عکس پانی میں جل گئے کتنے
جگنوؤں سے بہل گئے کتنے

شہرِ درد سے باہر بھی کہیں زمیں ہو گی
خواب سے پرے بھی تو کوئی آسماں ہو گا

ربط ایک دولت ہے، ہاتھ سے نہ جانے دو
کیا خبر کسی کو ہے کون کب کہاں ہو گا؟

بن گیا ایک کھیل سا اوروں میں خود کو ڈھونڈنا
کوچہ کوچہ قریہ قریہ گھومنا اچھا لگا

یہ حادثاتِ محبت جہاں جہاں گزرے
دل و نظر پہ قیامت کے امتحاں گزرے

ہجومِ اہلِ نظر سے وہ یوں گزرتے ہیں
کہ جیسے چاند ستاروں کے درمیاں گزرے

❁❁❁

تیری کہانی، میری (خالد محمود خان)

سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور: ۲۰۱۰ء

عرش صدیقی ملتان یونیورسٹی کے صدرِ شعبہ انگریزی تھے، جب اردو شعبے کے معتوبین کو، انگریزی کے شعبے سے کمک ملتی تھی۔ معراج محمد خان کی فکر سے بیعت کئے ہوئے این، ایس، ایف کا بڑا جتھہ پنجاب کے معاشی طور پر ستائے ہوئے علاقوں (لیہ، راجن پور، جام پور، شورکوٹ) کے فاقہ مست طالب علموں پر مشتمل ہوتا تھا، جو اگر انگریزی شعبے میں ہوتے تھے، تو ان میں سے بیشتر کو یہ امید بھی ہوتی تھی، کہ وہ جلد یا بدیر بے روزگار نہیں رہیں گے۔ اس لیے ان کی آواز رجزیہ ہوا کرتی تھی، انھی میں سے ایک خالد محمود ہے اور دوسرا رؤف کلاسرہ، جنھوں نے اپنی

پہچان کی بنیادی نسبتوں اور شرفِ آدمیت کی بحالی کے خواب سے دستبرداری کبھی قبول نہیں کی۔ خالد کا جثہ اسے کسی بڑے معرکے میں شرکت سے روکتا تھا، اس لیے اس نے پڑھنے پڑھانے پر توجہ دی، اچھی کتاب اور اچھے خیال کے لئے اس کا تجسّس اور اس کے حصول کے بعد اس دولت کو اپنے خویش قبیلے تو کیا، ہر طلب گار میں بانٹنا اپنا فرض سمجھتا تھا، عرش صاحب اس کی اس لپک اور اخلاص سے بہت محبت کرتے تھے۔ سی ایس ایس کرنے تک تو بہت سے انقلابیوں اور انسان دوستوں کے خواب سلامت رہتے ہیں، مگر پھر وہ کانِ نمک میں کوئی کارنر پلاٹ لے لیتے ہیں اور اپنے ماضی سے پیچھا چھڑانے کے لیے فرعونیت کا ماسک چڑھا لیتے ہیں، سوائے ان کے جو اپنا لکھنا پڑھنا جاری رکھتے ہیں۔ خالد محمود کی شخصیت کی سب سے بڑی قوت اس کے عالمانہ انکسار اور اچھے خیال کے لطف میں دوسروں کو شریک کرنے کے اضطراب میں پوشیدہ بھی ہے اور عیاں بھی۔

ایک زمانے میں سرسید احمد خان کے مضامین پڑھ پڑھ اور پڑھا پڑھا کر مجھے یہ دھن سوار ہوئی کہ وہ کمپیوٹر، جس کے استعمال سے مجھ سمیت شعبے کے تمام اساتذہ ناواقف ہیں، اگر اُردو شعبے میں آ جائے تو ہمارا شعبۂ اُردو جدید ہو جائے گا۔ وائس چانسلر اور انتظامیہ کے دیگر لوگ 'اُردو والے' کی یہ خواہش سن کر ہنستے تھے، میں نے اس کے کلاس فیلو اور اپنے شعبے کے استاد محمد ساجد خان کے ذریعے خالد تک یہ بات پہنچائی کہ تم جو کراچی میں بدنامِ زمانہ محکمے کسٹمز میں افسر ہو، کسی سیٹھ سے کہہ کر ایک کمپیوٹر کا عطیہ ہی دلوا دو، اس نے کہا 'سیٹھ کبھی گھاٹے کا سودا نہیں کرتے، وہ جواب میں جو فیور مانگیں گے، وہ آپ نہیں چاہیں گے کہ اس کا بار آپ کے ضمیر پر بھی منتقل ہو، البتہ آپ کا شعبہ یونیورسٹی کی اجازت سے ایک باقاعدہ اکاؤنٹ کھولے، جس میں میں ۲۰ نیک دل دوستوں سے کہہ کر پانچ پانچ ہزار روپے بھجوا سکتا ہوں، یوں ہمارا شعبہ اس قابل ہوا کہ ہم نے ایک کم کوش مگر مرحوم وائس چانسلر کی مخالفت کے باوجود ایم فل کلاس شروع کر دی، حالانکہ اس وقت پورے پاکستان میں ایک آدھ یونیورسٹی میں ایم فل اردو کے لیے رجسٹریشن تو ہوتی تھی، مگر کلاس کہیں بھی نہیں ہوتی تھی۔

خالد محمود کی فکری شخصیت کا ادبی روپ اس وقت میرے سامنے آیا، جب اس نے نیلسن منڈیلا کی آپ بیتی کا ترجمہ 'آزادی کا طویل سفر' کے عنوان سے کر کے مجھے مبہوت و مسحور کر دیا۔ میں منڈیلا سے عشق کرتا ہوں، اس نے جس طرح ایک میعادِ صدارت کی تکمیل سے بھی پہلے اعلان کر دیا کہ میں کوچۂ اقتدار سے باہر رہ کر بھی اپنی قوم اور انسانوں سے پیار کر سکتا ہوں، اس نے جس طرح 'آؤ سچ بولو، اعتراف تو کرو' جیسا کمیشن بنا کر انسانی ضمیر کے سامنے ایک آئینہ رکھ دیا، آج اپنی ۹۱ ویں سال گرہ پر وہ اس روئے زمین پر سب سے قابلِ عزت ذی روح ہے۔ پھر خالد کی کتاب 'یادِ یارِ مہرباں' آئی، جو بظاہر ایک دوست کی یاد میں لکھا ہوا ایک خاکہ ہے، مگر یہ اس کی اپنی شخصیت کے خدوخال

متعین کرنے کی ایسی کوشش ہے، جس میں اس کی دھرتی اور سنگی ساتھیوں کے ہاتھ میں پکڑا فاقہ مستی کا تیشہ کچھ عجب نگار خانہ بناتا ہے۔ اسی کتاب سے مجھ پر اس کے اسلوب کی تین مہارتیں بھی کھلیں، ایک تو یہ کہ وہ مرکب خیال کو بڑی سہولت سے ادا کرنے کا فن جانتا ہے، دوسرے وہ ناگفتنی بھی اس سلیقے سے کہہ جاتا ہے کہ درمیانی صلاحیت کے قاری پر معانی کی وہ پرت عیاں ہی نہیں ہوتی اور تیسری سب سے بڑی بات یہ ہے کہ وہ اپنے لب و لہجے کو تہذیب کے مرحوم مراکز کی تحویل میں نہیں دیتا۔ پھر اس نے پالیو کوہیلو کے ایک مقبول نیم فلسفیانہ اور نیم طلسماتی ناول کا ترجمہ 'کیمیا گر' کے نام سے کیا۔ ایک زمانہ تھا، جب میں بھی سمجھتا تھا کہ بڑا ادیب وہ ہے جو اس دنیا میں سے ہر طرح کی غلامی، ہر قسم کی جہالت اور ایک ہی طرح کا افلاس ختم کرنے کی جدوجہد کرتا ہے، اس میں مبتلا جن لوگوں کو اس کا احساس نہیں، ان میں اپنی تحریروں سے اس کا احساس پیدا کرتا ہے، جنھیں احساس ہے، ان کے احساس کو شعور میں بدلتا ہے اور یوں طبقاتی جدوجہد یا شرفِ آدمیت کی بحالی میں اپنا کردار ادا کرتا ہے مگر کیا ہر ترقی پسند ادیب ارون دھتی رائے بن سکتا ہے؟

اب جو اس نے کہانیوں کا یہ مجموعہ اس دعوے کے ساتھ پیش کیا ہے 'تیری کہانی میری' تو میں نے بہت لطف اٹھایا ہے اس کی پہلی کہانی سے ہی۔ انقلابِ ایران کے بعد سعودی عرب اور ایران کے مناقشے میں پاکستانی سماج میں مذہبیت ایک عسکری دھندہ بن گئی اور دیکھتے ہی دیکھتے بہت سے امام اور خطبہ خواں، بردہ فروش بن گئے، یتیم اور غریب بچے جہاد کے نام پر فروخت ہو گئے اور دیکھتے ہی دیکھتے ہمارے گاؤں کا تہذیبی سانچہ تک تبدیل ہو گیا، صوفیا کے مزاروں اور لڑکیوں کے مدرسوں کو بموں سے اڑانا تو اس مذہبیت اور عسکری دھندے کا محض ایک مظہر ہے، پہلے تو صوفیانہ اقدار کی عوامی اپیل کو شرعی پائجامے کی طرح تنگ اور مختصر بنایا گیا، 'چاچا خیر خیریت' میں خواجہ فرید اور پٹھانے خان کی نگری کی رہتل کو امام مسجد کی تحریک پر طاقت علی جس طرح غیر انسانی بنانے کی کوشش کرتا ہے اور خواجہ کی یہ کافی ایک متبادل ثقافت یا جنتِ گم گشتہ کے نقش ابھارنے میں ایک المیہ الاپ بن جاتی ہے۔

''نفس پلیت، پلیت کیتا، اساں اصل پلیت نہ ہاسے''

خالد کی کہانیوں کی مرکزی کردار عورت ہے، جس کا مرد کے ساتھ جسمانی رشتہ ہے، جو کسی بھی بستی کو تسلسل اور ثقافت کو، رس فراہم کرتا ہے۔ وہ بندش کے رہن سہن میں تقابل کے لیے فطری آزادی کے نقش ابھارتا جاتا ہے 'مرغے دانہ دنکا ڈھونڈنے کی بجائے اپنی مطلوبہ مرغی کو جانچتے رہتے، ان کے لئے منکوحہ ہونا ضروری نہ تھا۔' (ٹی، بی) 'ان پر کوئی پابندی نہیں ہوتی کہ وہ کب اور کس سے ملیں، اس سے کوئی پوچھے کہ کیا مرغے بھی مسلمان ہوتے ہیں، بے دین حرامبڑ!' (کالی گھوڑی والا) 'خالہ، سب رشتے ایسے ہی ہوتے ہیں، خوابوں میں اور طرح کے ہوں گے (کالی گھوڑی والا) 'میکاؤ میں راتیں انسانی جبلت کی طرح زندہ اور آزاد تھیں اور دن شعور کی طرح پابند اور محدود'

(وائرس گرل) اس میں شک نہیں کہ اس کے ہاں ویاگرا کا ذکر بھی اس طرح مل جاتا ہے 'یہ وی آ گرہ، بس تاج محل بنا دیوے، تاج محل، آ گرہ کو چھوڑیں۔

سارا پتھر، تاج اس کی طرف اڑتے آتے ہیں، بس کوئی ممتاز تو ہو، مگر درحقیقت اس سے یہ منافقت برداشت نہیں ہوتی کہ شاہی طبیب، بیٹھے کشتے تیار کریں، تو وہ تہذیبی ورثہ، حکمران اشرافیہ اپنے لیے یہ دوائی بطورِ خاص منگوائیں، مگر پاکستان میں اس کی قانونی سیل سے شرمائیں۔ 'وہ نسخۂ خاص تیار کرتے اور ہاون میں دستہ گھماتے تو آنکھیں بند کر لیتے ان پر ورودونزول کی کیفیت طاری ہو جاتی، ایسے میں وہ سراپا کشتہ ہو جاتے' (ٹی، بی)، مگر خالد کا اصل اضطراب 'تعلیمِ بالغاں' کے حوالے سے ہے، وہ فلسفہ، تاریخ، سیاست اور ادب کے حوالے سے جو کچھ پڑھتا ہے اور اپنے تصورات اور تجربات کے حوالے سے جانتا ہے، اس میں مخاطبین کی ایک بڑی تعداد کو شریک کرنا چاہتا ہے، (وہی سٹڈی سرکل کا رومان) اس کے لیے اس کی تین قوتیں اور ایک کمزوری ہے، اپنی معاشرت کا گہرا مشاہدہ، اپنی ماں بولی کی اپنی تخلیقی دنیا میں گونج کو قطب نما بنانے کی صلاحیت اور اسے تخلیقی ابلاغ دینے کا ایسا جوہر 'نابیناؤں کے گھر کا شیشہ نہ دشمن کی شکل دکھا سکا، نہ اپنی شکل کی وضاحت کر سکا' (کالی گھوڑی والا) 'ساری دنیا کے لوگ اپنی اپنی زندگی کا بوجھ اتارنے وہاں آ جاتے، اپنی اپنی خوشحالی کا پسینہ بہاتے، راتوں کو جاگ جاگ کر دنوں کی آغوش میں پناہ لیتے' (وائرس گرل) 'گلی میں خاموشی کے اپنے اوقاتِ کار تھے' (ٹی، بی) 'چاول اُڑ اُڑ کر تصویر کے ہونٹوں کو چھوئے بغیر منہ میں گم ہو جاتے' (ٹی، بی) 'ان کی بھوک نے انھیں سرمایہ داری کا پیمبر بنا دیا اور یہ ان کا مسئلہ ہی نہ رہا کہ ان کی وجہ سے بھوک اور موت کے کتنے جہان ورزانہ آباد ہو جاتے تھے' (غلام کہانی) 'ارے تخمو، حرام توپ، ٹینس لان پہ کلب میں کھلاڑی نہیں ہوتے، کلاس ہوتی ہے، گوری ہو یا کالی، کلاس! پکر پکر ہی رہتا ہے' (پکرز) 'باچھیں کھلی رہتی تھیں، ان میں سے ہوا، ہنسی اور حیا بیک وقت خارج ہوتی تھی' (کالی گھوڑی والا) 'جس معاشرے کے لوگ اپنے ہاتھوں غیر محفوظ ہوں، انہیں کوئی تحفظ نہیں دے سکتے' (زلزالھا) 'قلندر مسلسل پھیلتے ہوئے شامیانے کی طرح تھا' (بادل اور بوچھار) وہ اپنی معاشرت سے ابھرنے والے کردار اور فضا کے لیے اس خطے کی زبان سرائیکی کے لہجے کو مکالموں میں نہیں، بیان کا جزو بھی بناتا ہے اور اصرار کے ساتھ کہتا ہے 'چینا اُردو لغت میں کوئی لفظ نہیں، مگر میری مادری زبان کے اس لفظ کا اور متبادل چیتکبرا ہے۔۔۔ مگر معلوم نہیں میں کیوں اسے چینا کہنے پر ہی مصر ہوں، ویسے بھی ہر علاقے کی زبانوں کے اپنے حقوق ہوتے ہیں، بالکل انسانوں کی طرح، ان سے پیار کرنے کا مطلب ہرگز نہیں ہوتا کہ آپ دوسری زبانوں سے نفرت کرتے ہیں' (آخری منزل سے پہلے) یہی وجہ ہے کہ آپ دیکھیں گے وہ بڑے والہانہ انداز سے ادکھڑ، پیسہ پاؤ، حرامبڑ استعمال کرتا ہے اور ساتھ ہی محاورے بھی 'ڈھیری ہو گیا' یا 'ابتدا دو پہر میں کوئی قلیل ہی گذرتا ہوگا'

❁❁❁